پاک و ہند کی چند اسلامی تحریکیں

اور

علمائے حق

از

علامہ خلیل اشرف صاحب اعظمی قادری

باہتمام

ابو العطاء حافظ نعمت علی چشتی سیالوی

ناشر
مکتبہ فریدیہ جناح روڈ ساہیوال

پاک و ہند کی چند اسلامی تحریکیں

اور

علمائے حق

از

علامہ خلیل اشرف صاحب اعظمی قادری

باہتمام

ابوالعطاء حافظ نعمت علی چشتی سیالوی

ناشر

مکتبہ فریدیہ جناح روڈ ساہیوال

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب ـــــــــــ اسلامی تحریکیں

مصنّف ـــــــــــ علامہ خلیل اشرف صاحب اعظمی

ضخامت ـــــــــــ ۲۰۲ صفحات

تعداد ـــــــــــ ایک ھزار (۱۰۰۰)

ناشر ـــــــــــ مکتبہ فریدیہ ساھیوال

قیمت ـــــــــــ

آرٹ بائیڈنگ : پنجاب بائیڈنگ سنٹر۔ دربار مارکیٹ لاہور
بہ اہتمام نسیم کاشمیری

انتساب

اِسلام کے اُن جگمگاتے ستاروں

کے نام جنہیں تعصّب کے

اندھیروں میں دھکیل دِیا گیا۔

فہرست مضامین

کاتب امان اللہ خوشنویس چک ۵۴۳/ای بی ضلع (وہاڑی)

کتاب سے پہلے کتاب اللہ کا مطالعہ کیجیے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

غور سے سنئے

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ ھَدٰھُمُ اللّٰہُ وَاُولٰٓئِکَ ھُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ

پ ۲۳ سورہ الزمر آیت نمبر ۱۷،۱۲

خوشخبری دو میرے ان بندوں کو جو کان لگاکر بات سنتے ہیں پھر سب میں بہتر کی پیروی کرتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت فرمائی۔ اور یہی عقل والے ہیں۔

کافروں سے دوستی

تَرٰی کَثِیْرًا مِّنْھُمْ یَتَوَلَّوْنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَھُمْ اَنْفُسُھُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ وَفِی الْعَذَابِ ھُمْ خٰلِدُوْنَ وَلَوْ کَانُوْا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالنَّبِیِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مَا اتَّخَذُوْھُمْ اَوْلِیَآءَ وَلٰکِنَّ کَثِیْرًا مِّنْھُمْ فٰسِقُوْنَ ۝

پ ۶ سورہ المائدہ آیت نمبر ۸۰،۸۱

تم ان میں بہت سے لوگوں کو دیکھو گے کہ کافروں سے دوستی کرتے ہیں بیشک کیا ہی بری چیز ہے جو خود انہوں نے اپنے لئے تیار کی یہ کہ ان پر اللہ کا عذاب اترا اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے۔ اور اگر انہیں اللہ و نبی و قرآن پر ایمان ہوتا

تو کافروں کو دوست نہ بناتے۔ لیکن ان میں بہت سے فاسق ہیں۔

اگرچہ اپنے ہی ہوں

لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِیْرَتَهُمْ ط

پ ۲۸ سورہ المجادلہ آیت نمبر ۲۲

تم نہ پاؤ گے ان لوگوں کو جو یقین رکھتے ہیں اللہ اور پچھلے دن پر کہ دوستی کریں ان سے جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے مخالفت کی اگرچہ وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا کنبے والے ہوں۔

ممنوع ہے

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِیَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَیْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۔

پ ۲۸ سورہ الممتحنہ آیت ۱

اے ایمان والو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ، تم انہیں خبریں پہنچاتے ہو دوستی سے حالانکہ وہ منکر ہیں اس حق کے جو تمہارے پاس آیا۔

کافروں کے دوست خدا کے دوست نہیں

لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ط وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰهِ فِیْ شَیْءٍ (پ ۳ سورہ آل عمران آیت نمبر ۲۸)

مسلمان کافروں کو دوست نہ بنالیں مسلمان کے سوا۔ اور جو ایسا کریگا اسے اللہ اور اس کے رسول سے کچھ تعلق نہ رہا۔

ظالموں کی طرف مائل بھی نہ ہو

وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ

پ ۱۲ سورہ ہود آیت نمبر ۱۱۳

اور ظالموں کی طرف نہ جھکو کہ تمہیں (دوزخ) آگ چھولے گی اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی حمایتی نہیں پھر مدد نہ پاؤ گے۔

دورخی اختیار نہ کرو

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ۨ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ط اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا

پ ۵ سورۃ النساء آیت نمبر ۱۳۸

منافقوں کو خوشخبری دو کہ ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ وہ جو مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بناتے ہیں۔ کیا اُن (کافروں) کے پاس عزت ڈھونڈتے ہیں ساری عزت تو اللہ کے لئے ہے۔

کافروں اور بدمذہبوں کو رازدار نہ بناؤ

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ط وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۔ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۔

پ ۴ سورہ آل عمران آیت نمبر ۱۱۸

اے ایمان والو غیروں کو اپنا رازدار مت بناؤ ۔ وہ تمہاری برائی میں درگذر نہیں کرتے ان کی آرزو ہے کہ تمہیں ایذا پہنچے ۔ عداوت و دشمنی ان کی باتوں سے جھلک اٹھی ہے اور وہ جو سینہ میں چھپاتے ہیں (اس سے بھی) بڑا ہے ۔ ہم نے نشانیاں تمہیں کھول کر بتا دیں اگر تمہیں عقل ہو ۔

علماء کا فرض

سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

اِذَا ظَهَرَتِ الْفِتَنُ اَوْ قَالَ الْبِدَعُ وَسُبَّ اَصْحَابِيْ فَلْيُظْهِرِ الْعَالِمُ عِلْمَهٗ وَمَنْ لَّمْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۔ لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ مِنْهُ صَرْفًا وَّلَا عَدْلًا ۔

جب فتنے یا فرمایا گمراہیاں ظاہر ہوں اور میرے صحابہ کو بُرا کہا جائے تو فرض ہے کہ عالم اپنا علم ظاہر کرے ۔ اور جو ایسا نہ کریگا اس پر اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے اللہ اس کا فرض قبول کریگا نہ نفل ۔

رواہ الامام الخطیب البغدادی فی "الجامع بین آداب الراوی والسامع"۔

اظہار حقیقت اور مقام عبرت

ممتاز ماہر تعلیم جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی ذات گرامی پاک و ہند کے اہل علم کیلئے محتاج تعارف نہیں آپ فرماتے ہیں۔

(۱) اعلیٰ حضرت کے جو کمالات تھے ان کا تذکرہ تاریخ میں نہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تاریخ نے انصاف نہیں کیا۔ یا تاریخ انصاف نہیں کرنا چاہتی۔ بلکہ ہمارے پاس مواد کی کمی تھی۔ یہ درست ہے کہ اسلامی تاریخ کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں حضرت کے خیالات کے متعلق بہت کم لکھا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وعظ و تبلیغ صرف تقریری طور کی گئی۔ تحریری کام بہت کم کیا گیا اور اس میں انکے عقیدت مندوں کا قصور زیادہ ہے۔

(۲) جب میں علمائے پاکستان کے موضوع پر تحقیق کر رہا تھا تو میں نے محسوس کیا کہ جو کچھ تحریک جہاد کے بارے میں اب تک لکھا گیا ہے۔ وہ سب یکطرفہ ہے اس موقع پر میں نے شاہ فرید الحق سے رجوع کیا اور کچھ مواد حاصل کیا تب جا کر کہیں اپنی کتاب میں تذکرہ کر پایا۔

(۳) ملک و وطن ثقافت یا زبان قومیت کی بنیاد نہیں۔ بلکہ قومیت کی بنیاد عقیدت اور نظریے عبارت ہے اور ایمان کسی رنگ و نسل کا پابند نہیں۔ یہی بات مولانا احمد رضا نے مسلمانوں کو بتائی اور باطل نظریات کے خلاف اپنے ہزاروں خلفاء اور شاگردوں کیساتھ جہاد جاری رکھا۔

نہ میرا یہ مقام ہے نہ میری اتنی قابلیت ہے کہ میں کچھ کہہ سکوں کیونکہ انکے سامنے تو علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد زانوئے ادب تہہ کرتے تھے!

(۴) شاہ احمد رضا نے حقائق کو جان لیا تھا۔ میں خود تحریک ترک موالات میں شامل تھا۔ آج جب میں دیکھتا ہوں تو تمام واقعات میری آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ اس وقت ایک ہی نگاہ دور بین تھی جو جانتی تھی کہ مسلمانوں کا تصادم انگریز کی بجائے ہندوں سے ہوگا اور اُن کا موقف درست ثابت ہوا۔

(۵) اعلحضرت نے مولانا عبد الباری فرنگی محلی کو خطوط لکھے اور انھیں کہا کہ مسلمان حد اعتدال سے بڑھ گئے ہیں اُنھیں ان سے بچانا چاہیئے۔ اسی طرح مولانا شوکت علی کو لکھا کہ "کام کرتے ہو تو اسلام ترک نہ کرو" اور اصولوں پر قائم رہو!

(امام احمد رضا ص ۱۴ ہفت روزہ افق کراچی ۲۹ تا ۲۵ فروری ۱۹۷۸ء)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ اوّل

مدتوں سے یہ خواہش تھی کہ کوئی ایسی کتاب لکھی جاتی جس میں وہابیانِ ہند کی "تحریک جہاد" اور تحریک آزادی ہند ۱۸۵۷ء سے لیکر "تحریک قیام پاکستان" تک کے احوال وواقعات کا حقائق وشواہد کی روشنی میں بے لاگ اور بھرپور تجزیہ ہوتا۔ بہرصورت کتاب "پاک وہند کی چند اسلامی تحریکات اور علمائے حق" حاضر ہے۔ اسکے بہت سے مندرجات قارئین کو حیرت انگیز معلوم ہونگے۔ مگر کیا کیا جائے کہ یہ تمام حیرتناک باتیں خود "گھر کے" مورخین نے تحریر فرمائی ہیں۔

آپ شاید اندازہ بھی نہ فرما سکیں کہ اس قسم کے موضوعات پر قلم اٹھانا پل صراط پار کرنے سے کچھ کم نہیں ہوتا راقم کو بڑے جانگداز حالات سے گذرنا پڑتا ہے۔ الجھی ہوئی گتھیاں سلجھانے میں نہ جانے کتنی راتیں گذر جاتی ہیں اور بات وہیں رہتی ہے۔ حوالوں کی تلاش وجستجو ایک مستقل صبر آزما مسئلہ ہوتا ہے۔ اور انتہائی دردناک لمحات وہ ہوتے ہیں جب ناکردہ گناہوں کے الزام میں جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے اور اہل قلم کی بے انصافی پر قلم تھرانے لگتا ہے۔ اس وقت رہوار قلم کو سنبھالنا بڑا ہی دشوار مرحلہ ہوتا ہے۔

حاصل یہ کہ — یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجئے

اک آگ کا دریا ہے اور تیر کے جانا ہے

عقیدت نے تاریخ کو مسخ کر دیا

ان حقائق کے باوجود کہ تحقیقات کسی کی جاگیر نہیں دنیا کے ہر فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی موضوع پر بھی تحقیق کر سکتا ہے۔ جناب مسعود عالم ندوی اور ان جیسے اہل قلم خاصے برہم نظر آتے ہیں۔ چنانچہ خود جناب مسعود عالم صاحب ندوی اپنی کتاب "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" میں جناب ابوالحسن علی ندوی کی کتاب "سیرت سید احمد شہید" کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔

> مگر افسوس ہے کہ میرے عزیز ترین دوست اور میرے بھائی کا طریق نظر وفکر خالص عقیدت مندانہ ہے اور انہوں نے بزرگوں کی کوتاہیوں اور فروگذاشتوں سے نگاہ بچا کر نکل جانے کی کوشش کی ہے
>
> ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک صفحہ ۱۵

مورخ کی برہمی

اور کیا یہ ممکن نہیں کہ وہی عقیدت و ارادت خود جناب مسعود عالم صاحب پر بھی غالب ہو! بلکہ کتاب "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" کے مطالعہ کے بعد یہ امکان یقین میں بدل جاتا ہے۔ اور کتاب کے لب ولہجہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خود جناب مسعود عالم صاحب عقیدت و ارادت کی کس منزل پر کھڑے ہیں۔

> ایک طرف ان نفوس قدسیہ کی قربانیاں اور فداکاریاں ہیں اور دوسری طرف ہندوستان کے بے شرم مسلمانوں کی طرف سے "تکفیر و تفسیق" کا صد سالہ لٹریچر جو بدالیوں سے مدراس تک پھیلا اور اب تک پھیلایا جا رہا ہے "تو اب تکفیر کی تلوار کند ہو چکی ہے" خانقاہوں میں بیٹھ کر جوگیوں کی طرح مالا جپنے والے "سید احمد اور اسمٰعیل شہید" جیسے مجاہدین امت پر کفر کے فتوے لگائیں.... اور بدنصیبی یہ ہے کہ ان بدبختوں نے آجتک ان نیک بندوں کو معاف نہیں کیا۔
>
> ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۳۶

اور اس عبارت کا حاشیہ بھی بطور وضاحت ملاحظہ فرماتے چلیں

> ان لوگوں کو بدبخت کے علاوہ اور کیا کہا جائے ریگ کے تودے کو کوہ دماوند کہنا راقم کے بس کی بات نہیں اور اگر یہ جرم ہے تو عاجز کو اس کا اعتراف ہے
>
> (حوالہ مذکور)

اور اس کتاب کے حشیہ پر تو جناب ندوی کی برہمی اور نازک مزاجی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے اور ثقاہت کا مقدس خول اترتا ہوا نظر آتا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں

> باطل کو حق کہنا۔ یا اسکے مقابلے میں مدارات و مداہنت سے کام لینا راقم کے بس سے باہر ہے ہم باطل کو بہرحال باطل کہینگے۔ خواہ دنیا والوں کو اچھا لگے یا برا بندۂ حق کیلئے "تودۂ ریگ کو کوہِ دماوند" کہنا بہت مشکل ہے رسالہ جامعہ کے تبصرہ نگار نے زبان اور طرز انشا کی "سوقیت" کی شکایت کی ہے۔
>
> افسوس کہ ہم اس سے اتفاق نہیں کر سکتے۔ باقی اپنا اپنا ذوق ہے
>
> ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۵

اب ندوی صاحب ہی ارشاد فرمائیں کہ ان حالات کے پیش نظر ان کے خودساختہ "درتودۂ ریگ کے کوہ دماوند" کو "کوہ دماوند" کون کہے گا حق گوئی وحق پرستی میں دوسرے لوگ کچھ کم تو نہیں ہیں۔ اب اسے کیا کہا جائے کہ جناب ندوی کو دوسروں کی راست گوئی بھی زہر معلوم ہوتی ہو۔ جناب ندوی اپنی اس کیفیت کے متعلق خود ہی لکھتے ہیں۔

> لیکن اپنی اس بدنصیبی کا ماتم کن لفظوں میں کیا جائے۔ دل میں ایک ہوک اٹھتی ہے اور آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ جب کسی ملاں کے فتوے اور خوانین سرحد کی غداری یاد آتی ہے۔
>
> ـــــــ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک صہ ۴۲

کیا جناب ندوی کو علم نہیں کہ جب برہمی اور غیظ وغضب سے آنکھوں میں خون اتر آئے تو بصارت ختم ہوجاتی ہے اور بصیرت کا بھی کہیں دور دور پتہ نہیں چلتا۔ ظاہر ہے کہ ایسے مغلوب الغضب شخص سے کسی دانشمندی اور عدل وانصاف کی توقع نہیں کیجاسکتی۔

علم وحلم کا تقاضہ تو یہ ہے کہ فریقِ ثانی کے نظریات بھی سمجھنے کی کوشش کیجائے۔ اور فراخدلی کیساتھ اسکے استدلال پر بھی غور کیا جائے صرف اپنی ہی کہے جانا اور کسی کی نہ سننا کوئی معقول بات نہیں ہے "مگر میاں تو" اپنا اپنا ذوق ہے" کا عمل دخل ہے۔ ان حالات میں غیر جانبدارانہ تحقیق اور منصفانہ گفتگو کی کہاں گنجائش باقی رہتی ہے جناب ندوی خود ہی لکھتے ہیں۔

> راقم کا عجیب حال ہے جہاں مجاہدین راہ حق کا ذکر آیا وہ تمام اگلی اور پچھلی بے انصافیاں اور غلط بیانیاں ایک ایک کر کے یاد آنے لگتی ہیں۔ جو ارباب ہوا وہوس نے ان بزرگوں کے متعلق روا رکھی ہیں اور رہوار قلم بے قابو ہونے لگتا ہے
>
> ـــــــ کتاب مذکور صہ ۵۱

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مولانا ندوی کے ان بزرگوں کے متعلق کن لوگوں نے افواہیں اڑائی ہیں اور کن لوگوں نے غلط بیانیاں کی ہیں۔ اور کیوں۔

اس باب میں ہم علیٰ رؤس الاشہاد کہہ سکتے ہیں کہ مجاہدین کے سوانح نگار اور تذکرہ نویس تاریخ عجیب سے لیکر پہلی اسلامی تحریک اور اس سے ماقبل ومابعد تقریباً سبھی سید صاحب اور مولوی

محمد اسمٰعیل صاحب ہی کے مداح اور ثنا خواں تھے۔

چنانچہ جناب شیخ محمد اکرام موج کوثر میں اس کا اعتراف فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> اس افسوسناک انقلاب احوال کا تجزیہ کرنا اور اسکے اسباب وبواعث ڈھونڈنا تاریخ نگار کا تلخ فرض ہے۔ لیکن آج یہ کام کسی قدر آسان ہوگیا ہے۔ ابھی تک اس سانحہ کے متعلق فقط سید صاحب کے عقیدت مندوں کے بیانات ملتے تھے (جنکی ترجمانی عہد حاضر میں مولانا مہر نے بڑے جوش وجذبہ سے کی ہے) لیکن اب افغان نقطۂ نظر کا تھوڑا بہت اظہار بھی سامنے آگیا ہے۔
>
> (موج کوثر شیخ اکرام صفحہ ۳)

پھر بھی برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر۔

آخر "دو گھر کے" ان مصنفین کی گرفت کیوں نہیں کیجاتی۔ جو بے پر کی اُڑاتے رہے۔ اور معتقدین بغلیں بجالاتے رہے۔ ستم بالائے ستم تو یہ ہے کہ غلطیوں پر متنبہ کرنیوالے مردان حق کو "ساحرین افرنگ کا فسوں زدہ قرار دیا جاتا ہے۔ اور انگریزوں کی دعوت آڑانیوالوں کو کچھ نہیں کہاجاتا۔

تمہیں بتاؤ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟

رہی بات تکفیر وتفسیق کی تو انشاء اللہ تعالیٰ ہم اس کا بھی بھرپور جائزہ لینگے۔ اور دیکھینگے کہ پہاڑوں میں کیا ہو رہا تھا۔ اور بطور جواب آں غزل یہ بھی ملاحظہ فرمالیں تاکہ "تودۂ ریگ اور کوہِ دماوند کا مطلب واضح ہوجائے۔

ولیکن گر باین ناداں بگوئی ✽ خرے را اسپ تازی گو نگویم

جہاد کا نصب العین

آیئے دیکھتے ہیں کہ جناب سید احمد صاحب بریلوی اور مولوی محمد اسمٰعیل صاحب دہلوی کی تحریک جہاد کا نصب العین کیا تھا۔ آپ دیکھینگے کہ مقصد جہاد میں بھی یہ حضرات مورخین سخت اضطراب کے شکار ہیں۔

جناب مسعود عالم صاحب ندوی فرماتے ہیں

> پچھلے دو تین برسوں میں حضرت سید شہید اور انکی تحریک تجدید وجہاد کے متعلق جہاں اور غلط بیانیاں کی گئی ہیں وہاں یہ بھی کہا گیا ہے کہ سید صاحب کی جماعت دہلی کی سلطنت

کی کمزوری دور کرنے کیلئے کھڑی ہوئی تھی۔ حالانکہ سید صاحب اور انکے مقصد جہاد کی اس سے زیادہ اور کوئی تنقیص نہیں ہوسکتی۔

سید صاحب مکمل اسلامی نظام کے داعی تھے۔ دہلی کی حکومت کو انکے بلند مقاصد سے کیا نسبت کون نہیں جانتا کہ دہلی کی حکومت خاندانی، شخصی حکومت تھی۔ اور خلافتِ راشدہ کے نمونے پر حکومتِ الٰہی کی تاسیس کرنا سید صاحب کا نصب العین تھا

(ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص۲۵-۲۶)

یہاں یہ لکھنے میں شاید کوئی مضائقہ نہ ہو کہ اس قسم کی بوکھلاہٹیں صرف سید صاحب کے مداحین ہی سے سرزد ہوتی ہیں۔ اور تاریخ کے رُخ کو حسبِ ضرورت موڑتے رہتے ہیں۔ دہلی کی مسلمان حکومت اور اسکی مرکزیت سے یقیناً سید صاحب اور انکے ہمنواؤں کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ البتہ یہ لوگ انگریزوں کی دعوتیں کھایا کرتے اور گن گایا کرتے تھے۔ اسکے باوجود ندوی صاحب کا پورا طبقہ اس بات پر مصر ہے کہ سید صاحب ہی نہیں بلکہ آپکے جملہ متعلقین از اول تا آخر تحریک حریت کے سرفروش مجاہد تھے۔

مقصد جہاد کی ایک اور کہانی

یہ دعویٰ کہ "سید صاحب کی دعوت خالص کتاب وسنت کی دعوت تھی" اور ندوی صاحب کا یہ ارشاد کہ سید صاحب کا مقصد اور نصب العین خلافت راشدہ کے نمونے پر حکومت الٰہی کی تاسیس کرنا تھا۔ یقیناً قابل رشک ہے۔ اور ہمیں اسے تسلیم کرنے میں بھی کوئی جھجھک محسوس نہیں ہوتی۔ مگر جناب مولانا حسین احمد صاحب مدنی اپنی خودنوشت سرگذشت "نقش حیات" میں کچھ اور ہی کہانی سناتے ہیں۔ جس سے ندوی صاحب کے قائم کردہ نظریہ کی نفی ہوتی ہے۔ جناب مدنی تحریر فرماتے ہیں

سید صاحب کا اصل مقصد چونکہ ہندوستان سے انگریزوں کے تسلط واقتدار کا قلع قمع کرنا تھا جسکے باعث ہندو اور مسلمان دونوں ہی پریشان تھے اس بنا پر آپ نے اپنے ساتھ ہندوؤں کو شرکت کی دعوت دی اور اس میں صاف صاف انھیں بتا دیا کہ آپ کا واحد مقصد ملک سے پردیسی لوگوں کا اقتدار ختم کردینا ہے۔ اسکے بعد حکومت کس کی ہوگی اس سے آپ کو غرض نہیں ہے۔ جو لوگ حکومت کے اہل ہونگے ہندو ہوں یا مسلمان یا دونوں حکومت کرینگے۔

(نقش حیات ص۴۱۹ مولانا حسین احمد مدنی)

چنانچہ اسی سلسلے میں سرحد سے ریاست گوالیار کے مدارالمہام اور مہاراجہ دولت رائے سندھیا کے وزیر اور برادر نسبتی راجہ ہندو راؤ کو جو آپ نے خط تحریر فرمایا تھا وہ غور سے پڑھنے کے قابل ہے اس سے آپ کے اصلی عزائم اور ملکی حکومت کے متعلق آپکے نقطۂ نظر پر روشنی پڑتی ہے ص۲۱۹ اور پھر مولانا حسین احمد صاحب مدنی سید ابوالحسن صاحب ندوی کی کتاب "مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا"، کے حوالہ سے وہ خط بھی نقل فرماتے ہیں۔

> وقتے کہ میدان ہندوستان از بیگانگاں خالی گردیدہ وتیر سعی الیشاں بر ہدف مراد رسیدہ آئندہ مناصب ریاست وسیاست بطالبین آں مسلّم باد۔ یعنی جو وقت ہندوستان ان غیر ملکی دشمنوں سے خالی ہو جائیگا اور ہماری کوششوں کا تیر مراد کے نشانوں تک پہنچ جائیگا حکومت کے عہدے اور منصب ان لوگوں کو ملیں گے جن کو انکی طلب ہوگی۔
>
> (نقش حیات ص۴۲۰)

کیا یہ ارشادات انھیں کے متعلق نہیں جن کا دلی کی کمزور حکومت کیلئے اٹھنا انکے عظیم مقصد کی توہین تھی اور یہاں پورا ثمرۂ جہاد ہندوؤں کو بخش دینے کیلئے تیار ہیں۔ جناب مدنی اپنی اسی کتاب "نقش حیات" میں اسی بات کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

> ہندوؤں سے اختلاف مذہب کی بنا پر آپکو پرخاش تو کیا ہوتی آپ کمپنی کے ہاتھوں مظلومیت اور پامالی میں ہندو اور مسلمان دونوں کو یکساں جانتے تھے اور جہاد سے آپکی غرض دونوں کو ہی اجنبی اقتدار کی مصیبت سے نجات دلانا تھا۔ کامیاب ہونے کے بعد ملکی حکومت کا نقشہ کیا ہوگا اسکا فیصلہ آپ طالبین مناصب ریاست وسیاست پر چھوڑتے ہیں۔
>
> مگر ہندوؤں کو اطمینان ضرور دلاتے ہیں کہ وہ سید صاحب کی کوششوں کو اپنی ریاست کی بنیاد کے مستحکم ہونیکا باعث سمجھیں۔ ..... بیشک سید صاحب جگہ جگہ اعلائے کلمۃ اللہ اور دین رب العلمین کی خدمت کا ذکر کرتے اور اسی کو اپنی مساعی کا محرک بتاتے ہیں۔ لیکن آپ خوب سمجھتے ہیں کہ اعلائے کلمۃ اللہ کا ذریعہ صرف یہی نہیں ہے کہ ایک خود مختار گورنمنٹ قائم کیجائے اور خود حاکم بنکر دوسرے برادران وطن کو اپنا محکوم بنایا جائے ــــــــ بلکہ اس کا سب سے زیادہ موثر طریقہ یہ ہے کہ برادران وطن کو سیاسی اقتدار میں

اپنا شریک کر کے اسلامی فضائل اخلاق سے انکے دلوں کو فتح کیا جائے۔
اقلیت و اکثریت کے مسئلہ کی کوئی پیچیدگی آپ کے ذہن میں نہیں تھی کیونکہ آپکے نزدیک دونوں بے حقیقت چیزیں تھیں۔ جو اپنے عمل میں سب سے زیادہ پرجوش، فداکار، سرگرم اور مخلص و دیانتدار ہو گا امامت اور لیڈر شپ اسکے ہاتھ میں ہو گی خواہ وہ اقلیت کے فرقہ سے تعلق رکھے یا اکثریت کے فرقہ سے
(نقش حیات ص۲۱)

یہ ہے جہاد فی سبیل اللہ خالصۃ لوجہ اللہ" کی المناک غرض و غایت۔ جو بقول ندوی صاحب "کتاب و سنت کے عین مطابق تھی" اگر غور کیا جائے اور جناب حسین احمد صاحب مدنی کی تشریحات کو مد نظر رکھا جائے تو اس جہاد کا راستہ کتاب سنت سے ہوتے ہوئے بھارت کے موجودہ نظام سیکولر سٹیٹ تک جا پہنچتا ہے۔ تعجب ہے کہ سید صاحب کے مداحین پھر بھی اسے خالص جہاد فرماتے ہیں۔

ندوی صاحب فرمائیں کہ ہم لوگ کیا کریں۔ آپ کی توضیحات قبول کریں، یا دیوبند کے شیخ الحدیث کی تشریحات کو مانیں مذکورہ مندرجات سے کئی انہونیاں سامنے آرہی ہیں مثلاً یہی کہ دہلی کی حکومت کو مضبوط نہیں کیا جا سکتا! کیونکہ وہ خاندانی اور شخصی تھی۔ مگر ہندو راجاؤں کو یہ یقین دلایا جا رہا ہے کہ اپنی ریاست کی بنیاد کو مضبوط و مستحکم سمجھیں۔ اور یہ بھی غور کرنیکی بات ہے کہ "حکومت علی منہاج النبوۃ" کی بات اسوقت کہاں جا پہنچتی ہے جب کہ اس خالص جہاد سے حاصل کردہ حکومت الٰہی کو مولانا مدنی "فرقہ وار گورنمنٹ" قرار دیتے ہیں اور مورخین حضرات خلافت راشدہ کا نمونہ بنانے پر اصرار فرماتے ہیں۔

کیا اس طبقہ کا کوئی ایسا فرد ہے جو اس "فرقہ وار گورنمنٹ" کی وضاحت کر سکے!۔ سچ یہ ہے کہ برادران وطن" دوسرے لفظوں میں ہندوؤں کی ہواخواہی اور چاہت نے مولانا مدنی سے ایسی ایسی باتیں کہوائی ہیں جنھیں پڑھ کر ایک مخلص مسلمان لرز اٹھتا ہے۔

اب مولانا مدنی سے کون پوچھے کہ حضرت خیر القرون (دور رسالت میں) اور پھر دور خلافت میں۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ اور انکے اطراف و جوانب میں مشرکین و یہود اور نصاریٰ آباد تھے یا نہیں اور یہ کہ آپکی اصطلاح میں وہ "برادران وطن" تھے یا نہیں۔ اگر تھے تو انھیں کیوں اسلامی حکومت میں شامل نہیں کیا گیا۔ کیا آپ اس حکومت کو "فرقہ وار گورنمنٹ" کہہ سکتے ہیں!

ہمیں قرنِ اول میں کہیں یہ بات نہیں ملتی کہ حکومت برادرانِ وطن کے سپرد کر کے اخلاق فاضلہ کی مار دی جا رہی ہو ؎ ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ علمائے کرام کے اس نیشنلسٹ طبقہ نے اپنے اسلامی اخلاق فاضلہ سے کتنے "برادرانِ وطن" کو دوزخ سے نجات دلائی ہے؟ اسکے خلاف اگر تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو بات بالکل برعکس نظر آتی ہے مبتلا یہ کہ مزارات کے بجائے، سمادھی پر پھول چڑھانا۔ میلاد کے بجائے رام لیلا کی تیاری کرنا۔ یا رسول اللہ کے بجائے، گاندھی جی کی جے پکارنا۔ درود و سلام کے بجائے۔ بندے ماترم کے ترانے گانا۔ روا داری میں ذبیحہ گاؤ کو ممنوع قرار دینا وغیرہ وغیرہ

؎ پھر بھی کہتے ہو بھول جاؤں مجھے بخدا میرے بس کی بات نہیں

بات شخصی حکومت کی

رہی بات شخصی حکومت کی تو یقیناً اس حکومت کو "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" نہیں کہہ سکتے۔ مگر عرف عام میں اسے اسلامی حکومت تو کہہ سکتے ہیں۔ اگر یہ بھی نہیں تو مسلمانوں کی حکومت ہی کہہ لیجئے ورنہ تیرہ صدیوں کا طویل راستہ تاریکیوں میں گم ہو جائے گا۔ دور بنو امیہ، دور بنو العباس، دور عثمانی ترکی، جسکے لئے تحریک خلافت چلائی گئی۔ اور پھر فاطمیوں، علویوں، سلجوقیوں، غوریوں، غزنویوں، مغلوں، افغانوں کے متعلق بھی دریافت کیا جائیگا کہ انکے متعلق کیا فرماتے ہیں علمائے دین!

اور پھر ان سب کے بعد ہم یہ بھی پوچھینگے کہ حکومت سعودیہ عربیہ کے متعلق آپ کے کیا خیالات ہوں گے جسکے اجائے قرآن و سنت کا نقارہ پورا قافلہ بڑے شد و مد سے بجا رہا ہے۔ اس کی کچھ تفصیل جناب شورش سے سنئے وہ کیا فرماتے ہیں۔ حالانکہ اُنہوں نے بھی ساری عمر اسی مکتبۂ فکر کی نمائندگی ہمنوائی فرمائی ہے۔ اور موصوف کبھی علمائے دیوبند کی صف اول کے جانبازوں میں تھے۔ اور آخری عمر میں جناب مودودی صاحب اور ان کی جماعت سے بڑا گہرا تعلق قائم ہو گیا تھا۔ جناب شورش کی اس جرأت پر علمائے دیوبند اتنے برہم ہوئے اور اُنکے خلاف ایسی دل آزار زبانیں استعمال کیں کہ وہ ان علمائے کرام کے ساتھ جنت میں بھی جانے کیلئے تیار نہ تھے۔

اور جب پانی سر سے گذر گیا اور الزامات و بہتان کی یلغار حد سے گذر گئی تو بامر مجبوری اُنہوں نے بھی رہوار قلم کی باگ ڈھیلی کر دی۔ جناب شورش گھر کے بھیدی تھے ان مقدسین کو گھر پہنچا کر دم لیا

انہوں نے ہر سازش کو بے نقاب کیا۔ نہ حکمرانِ نجد کی شمشیر براں، نہ علمائے دیوبند کے دھار دار فتاوے اور نہ ہی ندوی صاحب جیسے لوگوں کی ہلاکت خیز تحریریں انکے سدِ راہ ہوئیں۔ فرماتے ہیں

> سعودی حکومت قرنِ اول کی حکومت نہیں! آجکی بادشاہت ہے۔ بادشاہت منشائے نبی نہیں۔ قیصر و کسریٰ کی یادگار ہے اور ہم نے اپنے لئے اسے مشرف باسلام کرلیا ہے۔
>
> شب جائیکہ من بودم ص۷۹ شورش کاشمیری

جناب شورش علمائے دیوبند سے متعلق ہونیکے باوجود قبروں کا انہدام اور آثار مقدسہ کی پامالی دیکھ کر رزاٹھتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

> جو لوگ اسکا نام قرآن و سنت کے احکام رکھتے وہ خود کس منہ سے تاج شہی پہنتے۔ اونچے اونچے محل بناتے محمد عربی کی دولت سمیٹتے اور اسکا نام خزانہ شاہی رکھتے ہیں جس ذات اقدس کے صدقہ میں عزتیں پائی ہیں اُنکے آثار اقدس کی یہ بیحرمتی!
>
> یہ قرآن و سنت نہیں اہانت اور صریح اہانت ہے۔ اللہ کی زمین اور اُسکے دفینے اس کی مخلوق کے مال ہیں کسی فرد کو یہ حق حاصل نہیں کہ انسان کا گلہ بنالے، خود چرواہا بن بیٹھے، گوشت کھائے کھالیں بیچ ڈالے ۔ موت کسی کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ جو موت کی اسطرح ہتک کر رہے ہیں..... لیکن جنت معلیٰ میں وہ لوگ سو رہے ہیں جو ہمیں زندہ کر گئے، ہمیں بقا دے گئے۔ جنہیں پھیر کر شاہوں پر نگاہ کرتے تو اُنکی گودڑیوں سے خلعت فاخرہ کانپ اُٹھتے تھے۔ سعودی حکومت عشق اور شرک میں فرق نہیں کرسکی ہے۔
>
> شب جائیکہ من بودم ص۲

قبروں کا استیصال

سید صاحب کے جہاد کے منجملہ مقاصد میں قبر پرستی کا استیصال بھی تھا چنانچہ جناب مسعود عالم صاحب ندوی اپنی کتاب "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" میں "دعوت اور مشن" کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں۔

> سید صاحب کی دعوت خالص کتاب وسنت کی دعوت تھی بدعت وشرک کا مٹانا اُن کا مشن تھا۔ وہ دینِ محمدی میں عہدِ فاروقی کی پاکیزگی اور شوکت پیدا کرنا چاہتے تھے توحید خالص کی تبلیغ قبر پرستی کا استیصال مراسم تعزیہ کو بیخ وبن سے اُکھاڑ پھینکنا اور نکاح بیوگان کی ترویج اُن کی دعوت کے اہم اجزا تھے۔
>
> ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص۲۷

مسلمانوں پر قبر پرستی کا الزام نہایت سنگین الزام ہے۔ دنیا بھر میں جہاں کہیں بھی مسلمان آباد ہیں کہیں بھی قبر پرستی نہیں ہوتی مزار اور صاحب مزار کے احترام اور فاتحہ خوانی کو پرستش اور پوجا سے تعبیر کرنا بہت بڑا المیہ ہے۔ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام نامی استعمال کر کے مزارات کو منہدم اور پامال کرنا انتہائی بربریت ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تمام وہابیہ نے جذبہ توحید کے فروغ کیلئے قبروں کے انہدام اور استیصال کو جزو ایمان بنا رکھا ہے۔ اور ہم بالیقین کہہ سکتے ہیں کہ مکہ و مدینہ کی قبروں کے انہدام میں یہی جذبہ کارفرما تھا۔ چنانچہ وہابیانِ نجد نے حجازِ مقدس پر غلبہ و استقلال کے بعد جشنِ فتح قبروں کی پامالی ہی سے شروع کیا تھا۔

یہاں یہ بحث نہیں کہ اسکی شرعی حیثیت کیا ہے (اس باب میں علمائے کرام نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ مزید کی ضرورت باقی نہیں رہتی) میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اپنے بزرگوں اور اپنے آباؤ اجداد کی قبروں کے بارے میں ان موحدین مقدسین کا طرز عمل کیا رہا ہے۔
یہی جناب مسعود عالم صاحب ندوی اپنی اسی کتاب "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" میں بڑی تفصیل سے ایک مجاہد کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> جب بیس سال کے بعد انڈمان سے واپس ہوئے (۱۳۰۰ھ) تو خاندانی قبرستان کا یہ دلدوز منظر دیکھ کر دل بھر آیا اور کراما کاتبین کی انتہائی سختی کے باوجود آنکھوں سے خون کے قطرے ٹپک پڑے۔۔۔ میں نے چاہا کہ اپنے خاندانی مقبرہ کو کہ جہاں چودہ پشت سے ہمارے آباؤ اجداد دفن ہوتے چلے آئے تھے جا کر دیکھوں اور خصوصاً اپنے والدین ماجدین غفر اللہ لہما کے مزار کی زیارت کروں اور اس پر دعائے مغفرت اور فاتحہ پڑھوں۔ مگر ہر چند کوشش کی پتہ نہ ملا بعد تجسس و تفحص بسیار غور و فکر کر کے قرینہ سے معلوم

ہوا کہ حضرت والدین ماجدین کی قبر کھود کر اس پر بنا ہے عمارت میونسپلٹی بنادی گئی ہے۔

(ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک صفحہ ۱۳)

اور پھر صفحہ ۲۱ پر مزید تحریر فرماتے ہیں۔

اے حضرات ناظرین! اس وقت اس حرکت کا جو ہمارے اموات کیساتھ کی گئی جو صدمہ دل پر گذرا وہ بیرون از حیطۂ تحریر و تقریر ہے اس وقت اس کی یاد سے رونگٹے تک کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے حرم میں ہمارے اموات و آباء و اجداد کی قبریں کیوں کھودی گئیں اور وہ مقبرہ کیوں معرض ضبطی میں آیا "عادل گورنمنٹ" نے کیوں یہ کام کیا۔

(ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک صفحہ ۱۳۱)

اس کیوں کا جواب تو وہ عادل گورنمنٹ" ہی دے سکتی ہے کہ اس نے کیوں ایسا کیا۔ البتہ بلا جرم مکہ و مدینہ کے مقابر پامال ہو سکتے ہیں تو یہاں کونسی چیز مانع ہے۔ سنئے حضرات! اختلافات نظریات کے باوجود ہم قبروں کی اس پامالی کی تائید نہیں کر سکتے۔ انگریزوں نے وہابیان صادقپور کی قبروں کو مسمار کر کے انتہائی سنگدلی کا مظاہرہ کیا ہے۔

مگر مکافات عمل بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جنکی آنکھیں مقبرہ سیدہ خدیجۃ الکبریٰ سیدنا امیر حمزہ، شہدائے بدر و احد، روضۂ فاطمۃ الزہرٰی، آرام گاہ شہدائے کربلا کی پامالی اور انکی بے حرمتی پر غمناک نہیں ہوئی تھیں۔ اب ان کی آنکھوں سے کراما کاتبین کی انتہا زور آوری کے باوجود خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

بہر صورت تاریخ اپنے اوراق الٹتی ہے۔ اور تلک الایام نداولہا کی تفسیر ہر دور میں لکھی جاتی ہے۔ عرب اور حجاز مقدس میں انگریزوں کی مدد سے نجدیوں نے جو کچھ کیا۔ قدرت نے انگریزوں ہی کے ہاتھوں ہندوستان میں انکے مویدین کیساتھ وہی صورت پیدا کر دی۔

دیکھئے ندوی صاحب کیا فرماتے ہیں۔

نجد کی دعوت کے علمبردار شیخ الاسلام محمد ابن عبدالوہاب کی نسبت کرنا ہو تو محمدی کہنا چاہیے .... البتہ عزم و عمل کی مردہ قوتوں کو بیدار کیا۔ ہیجان پیکروں میں زر... کی حرارت

ڈالدی اور پورے خطے کو اسلامی رنگ میں شرابور کر دیا۔ یہ ایسا گناہ ہے جسے شاطران فرنگ اور انکے ہو خواہ معاف نہیں کر سکتے۔

(ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک صـ۱۳)

جہاں شریعت کی فرمارُوائی ہے

کاش ایسا ہی ہوتا جیسا کہ ندوی صاحب نے فرمایا اور جبکی حمد و ثنا میں ندوی صاحب جیسے سیکڑوں لوگ "دعوت کھاکر خلعت لیکر" شب و روز رطب اللسان نظر آتے ہیں۔

اس باب میں جناب شورش کے علاوہ ہم میں سے کوئی کچھ کہدیتا تو کہرام مچ جاتا۔ ہزاروں زلزلے لہرا اُٹھتے اور نہ جانے کتنی آنکھیں خون اگلنے لگتیں۔

یاد رہے کہ جناب شورش نے جو کچھ لکھا ہے وہ ایک ایسی دستاویز اور ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ لکھتے ہیں۔

غار ثور۔ اداس پڑا ہے اس کا تذکرہ قرآن میں موجود ہے لیکن بادشاہت نے قرآن و سنت کی آڑ میں اس پر ویرانی کی دیوار کھینچ دی ہے۔

(شب جائیکہ من بودم صـ۳۸)

اور صفحہ ۲۸ پر لکھتے ہیں۔

ان کے ہاں سب سے زیادہ خطرناک چیز کتابیں ہیں، اخبار اور رسالے ہیں، اصل وقت زبان کی ہے۔ کلام اللہ کا اردو ترجمہ بھی یہاں روک لیا جاتا ہے۔

لیکن لبنان کے عربی جرائد و رسائل بالخصوص جن میں حوا کی بیٹیوں اور زلیخا کی ہم نشینوں کا نخرہ نمایاں ہوتا ہے ہر قدغن سے آزاد ہیں ــــ وہ روزانہ آتے اور روزانہ بکتے ہیں اور انکی خریداری عورتوں میں بکثرت ہوتی ہے ــ ان برہنہ اور نیم برہنہ رسالوں پر کوئی پابندی نہیں۔ پابندی اس لٹریچر پر ہے۔ جسکے متعلق یقین کیا شبہ ہو کہ اس میں مزاج شاہی پر چوٹ پڑتی ہے۔

(کتاب مذکور صـ۲۸)

مولد النبی (فداہ ابی و امی) کی زیارت کے بعد لکھتے ہیں۔

میں مولد النبی اور بیت النبی (صلی اللہ تعالےٰ علیہ والہ وسلم) کے پاس کھڑا یہ سوچ رہا کہ انسان کیا ہے؟ حضور کی مکی زندگی یاد آ گئی ان مکہ والوں نے حضور سے کیا سلوک کیا تھا کہ ان کے مکانوں سے کوئی سلوک کرتے۔

غار حرا کی زیارت کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

اس قسم کی دو چار چیزیں محفوظ کر لی جائیں تو عیب کیا ہے؟ اس سے قرآن وسنت کی خلاف ورزی کہاں ہوتی ہے اور کہاں منشائے الٰہی کی نفی ہوتی ہے

آخر حکومت خود کو بھی تو محفوظ کر رہی ہے۔ اگر شریعت کا اتنا ہی خیال ہے تو شریعت یہ نہیں ہے کہ جبل نور یتیم پڑا ہے اور اسکی نگہداری سے قطع نظر کیا جائے۔

شریعت کے احکام معاشرہ اور ریاست کیلئے ہیں آثار و مظاہر کیلئے نہیں....

جہاں اجتہاد لازم ہے وہاں اجتہاد کا نام بدعت بلکہ بغاوت رکھدیا ہے —

خلفائے راشدین کیا اپنے ساتھ حفاظتی دستے رکھا کرتے تھے۔ وہ طیاروں میں اڑتے پھرتے تھے۔ کیا انہوں نے گرما اور سرما کے دارالحکومت بنائے تھے. کیا ان کے محل اور قصر تھے۔ کیا انکے لئے سیالے تھے۔ وہ شاہانہ کروفر سے حرم میں داخل ہوتے تھے۔ انھیں جلالۃ الملک کہا جاتا تھا۔ وہ فلک بوس عمارتیں کھڑی کرتے تھے وہ سونے کے زیوروں اور ریشم کے کپڑوں میں تلتے تھے۔ وہ ٹیلیویژن لگاتے تھے... جب نئے دور کی سب چیزیں قبول کر لی ہیں تو ایک تاریخ اور اسکے خزینے ہی ایسے ہیں جنھیں محفوظ رکھنا بدعت ہے۔

یا خلاف سنت!..... یہ سب اللہ کے نبی کی آخری نشانیاں ہیں. تاریخ کے جواہر ریزے اور عقیدے کے شہ پارے ہیں انھیں سے تاریخ کو تحقیق اور زائروں کو عشق کی راہیں ملتی ہیں — غار حرا سیرت النبی کا پہلا پڑاؤ ہے۔ ابتک وہاں حضور کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہیں۔ اور انکے ہونٹوں کا ارتعاش ہوا میں گھلا ملا معلوم ہوتا ہے۔... سلام ہو اے جبل نور سلام ہو اے غار حرا!

شب جائیکہ من بودم صد ۶۶

بدر کی زیارت کے بعد تحریر فرماتے ہیں!

ان کی قبریں آج وارثان سنت کے ہاتھوں پامال ہو چکی ہیں تاریخ کے وہ عظیم الشان آثار محو ہوتے جا رہے ہیں جنہیں عتبہ اور ابوجہل نہ مٹا سکے انھیں ہم اپنے ہاتھوں محو کر رہے ہیں ...... یہ قرآن وسنت نہیں یہ سنگینی و سنگدلی ہے۔ کہ رسول اللہ کی یادگاریں مٹائی جائیں اور اپنی یادگاریں کھڑی کی جائیں۔

شہاب جائیکہ من بودم ص ۱۲۵

احد کی زیارت کے بعد لکھتے ہیں۔

اس احد کے دامن میں زمین سے دو زینے بلند اور پہاڑ سے ڈھیر دل نیچے حضرت امیر حمزہ عبداللہ ابن جحش اور مصعب ابن عمیر کی قبریں ہیں لیکن آل سعود کی شرعی پلٹن نے ہموار کر دی ہیں۔۔۔ ہندہ نے حمزہ کا کلیجہ چبایا تھا لیکن انہوں نے حمزہ کی قبر چبا ڈالی

کتاب مذکور ص ۱۲۵

اور پھر لکھتے ہیں۔

ان مزارات کی بے حرمتی کا نام انکے نزدیک قرآن وسنت ہے کیا انھیں روحوں کے اس سفینے کی عظمت کا اندازہ نہیں... گمراہی روکنے کی آڑ میں بے حرمتی جائز ہے؟ کیا عشق کا نام عربوں کی لغت میں شرک ہے ... میں عربی سے واقف ہوتا تو کوہ صفا اور جبل احد پر کھڑے ہو کر پکارتا اے محمد کے ہم وطنو تم نے جنت البقیع میں ہل پھروا کر ہمارے دل کے شیشے توڑ دیے ہیں اور اب ان میں کوئی صدا باقی نہیں رہ گئی ہے۔

شہاب جائیکہ من بودم ص ۱۲۶

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا

قارئین! نہ چاہنے کے باوجود بھی بات بڑھتی چلی گئی اور مقدمہ طویل سے طویل تر ہوتا چلا گیا۔

- سچ یہ ہے کہ کچھ بڑے لوگوں سے چند غلطیاں ہو گئی تھیں۔ جن پر درد مند لوگوں نے انتباہ کیا تھا۔ اور ان غلطیوں کی نشاندہی کی تھی۔ مگر اصلاح قبول کرنے کے بجائے ضد اور ہٹ دھرمی کا طریقہ اختیار کیا گیا اور ایک نہ ختم ہونیوالی سرد جنگ شروع ہو گئی۔ اور حالات یہاں تک جا پہنچے

کہ جو لوگ شریعت و طریقت میں ایک تھے جماعتوں اور فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔

● اور کچھ لوگوں نے یہ کیا کہ اپنی بات رکھنے کیلئے تاریخ کے چہرے کو مسخ کر ڈالا تاکہ اپنے ممدوحین کو فرش سے اُٹھا کر عرش پہ بٹھا سکیں۔ اور دوسروں کو عظمت کی بلندیوں سے مذلت کی گہرائیوں میں دھکیل دیں۔

مگر جس طرح بلند و بالا پہاڑوں کے دامن میں۔ وسیع زمین کی پرسکون تہوں میں اور ناپید کنار سمندروں کی گہرائیوں میں بے شمار خزائن اور بے پناہ عجائبات دفن ہیں۔ اسی طرح تاریخ کی پنہائیاں بھی گوناگوں حالات و واقعات سے لبریز ہیں اور اصل شکل و صورت بہر حال ظاہر ہو کر رہتی ہے

● زیر نظر کتاب "پاک و ہند کی چند اسلامی تحریکیں اور علمائے حق" اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک تاریخی، سیاسی، مذہبی جائزہ ہے اس میں مختلف موضوعات پر بحث کی گی ہے اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس دور میں اس کی سخت ضرورت ہے۔

اس بات سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ صحیح صورت حال کا اظہار ہی لوگوں کو غلط فہمیوں سے بچا سکتا ہے۔ آج حقیقت حال کی واقفیت ہی کیوجہ سے ایک بہت بڑا طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ جناب سید احمد صاحب بریلوی اور مولوی محمد اسمٰعیل صاحب دہلوی کی تحریک جہاد نے انگریزوں کو لرزہ براندام کر دیا تھا۔

اور یہ کہ پٹھان ظالم اور منافق تھے۔ مجاہدین مظلومیت کی حالت میں شہید کر دیے گئے۔ مگر نفس واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ افسوس کہ ماضی میں پٹھانوں کے نقطۂ نظر جاننے کی کوشش نہیں کی گی اور یکطرفہ فیصلہ ہوتا رہا۔

● صحیح یہ ہے کہ سید صاحب اور مولوی محمد اسمٰعیل صاحب نے انگریزوں سے ایک لڑائی بھی نہیں بلکہ انکے مابین خاصا بھائی چارہ رہا ہے۔ البتہ پٹھانوں پر انھوں نے عرصۂ حیات ضرور تنگ کر دیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ انھیں بیدریغ لوٹا اور قتل کیا گیا۔ بلکہ انکی عصمتوں کو بھی پامال کر دیا گیا تھا۔ نتیجتہً پٹھانوں ہی کے ہاتھوں ہند کی وہابی تحریک اپنے خوفناک عزائم کیساتھ انجام کو پہنچ گی۔

● اسی طرح جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں انکی کوئی خاص خدمات نہیں۔ یہ لوگ انگریزوں کے خوف سے چھپتے پھرتے تھے۔ بلکہ حریت پسندوں سے جنگ کرتے تھے مگر جانبدار مکاروں نے انھیں

مجاہدین کی صف اول میں کھڑا کردیا ہے اور اب تحریک آزادی کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔

- تحریک خلافت کے دوران، تحریک ترک موالات چلائی گئی اور پھر ہندوؤں کے اشارے پر تحریک ہجرت کے بانی مبانی بنے ان موحدین نے مشرکین سے ناتا جوڑا، فرنگی اور برہمنی سازش کے تسک ہوئے۔ جسکا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ جوش و جذبہ سے اٹھائی ہوئی یہ تمام تحریکیں ناکام ہوگئیں۔ پھر بھی اسلا اخوت کو توڑنیوالوں اور "برادران وطن سے غیر فطری رشتہ جوڑنیوالوں کی آنکھیں سرخ ہیں۔

- ہندو اکثریت کے دباؤ، اور گاندھی جی کے اشارے پر "برادران وطن" کو خوش کرنے کیلئے ذبیح کو ممنوع قرار دیا۔ اور ان سے ملکر ایک قومی نظریہ کی بنیاد رکھی۔ مسلمانوں کے ملی تشخص کو پامال کیا۔ ایمان والوں کو اتھاہ تاریکیوں کے حوالے کردیا۔

- مسلمانوں کے ملی اور قومی امتیاز و تشخص کا سوال پیدا ہوا اور قیام پاکستان کی تحریک چلی تو حضرات اخوت اسلامی سے انحراف کرکے ہندوؤں سے مل گئے۔ قیام پاکستان اور مسلمان رہنما شدید ترین مخالفت کی مگر پاکستان بنتے ہی "تحریک پاکستان کے" ہیرو نظر آنے لگے۔

چوہدری حبیب احمد اور نیشنلسٹ علماء

مورخ ہونا تو بڑی بات ہے مجھے تو اپنے آ کو تاریخ کا طالب کہنے بھی شرم محسوس ہو ہے۔ مگر یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ ہر انسان فطرۃً تاریخ سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اسے طبعاً ماض و حال بلکہ مستقبل سے بھی دلچسپی ہوتی ہے۔ اپنے گرد و پیش رونما ہونیوالے احوال و واقعات سے با رہنے کی کوشش کرتا ہے۔

اور یہ کون نہیں جانتا کہ تاریخ ایک ایسا آئینہ ہے جسکے سامنے آنے کے بعد کوئی شخص اپ چہرے کے حسن و قبیح کو نہیں چھپا سکتا اس سلسلے میں بجائے اسکے کہ میں خود کچھ عرض کروں جناب چوہدری حبیب احمد صاحب کی کتاب "تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء" سے اقتباس پیش دینا ہی زیادہ مناسب سمجھتا ہوں۔

> تاریخ کیا ہے! یہ عجیب دودھاری تلوار ہے یہ موافقت و مخالفت اور حمایت و مخاصمت کے کردار کے تمام پہلوؤں کو نکھار اور ابھار کر سامنے لاتی ہے۔ اگر کسی قوم کے پاس اسکی صحیح تاریخ موجود ہو تو وہ قوم اپنے ماضی کے تجربات کے آئینے میں اپنے حال کو درخشندہ

اور مستقبل کو تابندہ بنا سکتی ہے۔ لیکن اگر تاریخ غلط ہے تو وہ غلط فہمیوں کی ایسی اندوہناک تاریکیوں میں گھری رہتی ہے جس سے اس کا نکلنا محال ہو جاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

آج شاید کوئی یہ بھی باور کرنے کو تیار نہ ہو کہ پچیس۲۵ تیس۳۰ برس قبل ہمارے چوٹی کے مذہبی پیشوا اس قسم کے کھیل بھی کھیلتے رہے ہیں اور یہ سب کچھ واردھا آشرم کے مہاتماؤں اور آنند بھون کے پنڈتوں کی نیشنلسٹ فوج کا ہراول دستہ بنکر سرانجام دیا گیا۔ ۔ ۔ ۔ ولتعات وحقائق کی یہ دلاوز جگر سوز تفصیل کتنی ہی غیر پسندیدہ کیوں نہ ہو بہرحال ہماری تاریخ آزادی واستقلال کا عبرت انگیز باب ہے۔

ان مقدسین نے غیروں کے اشارے پر "متحدہ قومیت" کے نام پر ایک نیا سومنات تعمیر کیا اور تحریک پاکستان کے خلاف اس بت کی پرستش عین اسلام قرار دی۔ ۔ ۔ ۔ تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ علامہ اقبال اور مولانا حسین احمد مدنی کے مابین یہی معرکۂ دین و وطن رونما ہوا۔ خود ہمارے گھر کے جبہ و دستار میں لپٹے ہوئے، مذہبی پیشوا امام الہند اور شیخ الہند اسکے مقابل میں مقدمۃ الجیش بناکر کھڑے کئے گئے۔ ۔ کیا آج ہماری نئی نسل یہ تصور بھی کر سکتی ہے کہ مسلمانوں کیلئے جس جداگانہ مملکت کے حصول و قیام کی جنگ لڑی جارہی تھی اسکی سب سے زیادہ مخالفت خود مسلمان اور اسکے مذہبی اجارہ داروں کیطرف سے ہوئی! لیکن اس تلخ اور المناک حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ایسا ہوا اور روز روشن میں ہوا!

لہذا ضروری ہے کہ ان قوتوں کے خدوخال بھی نمایاں اور واضح کر دیں جو پرفریب اداؤں، عشوہ طرازیوں اور اسلام کے مقدس زریں نقاب اوڑھ کر ملت کی نشاۃ ثانیہ کی مخالفت میں پیش پیش رہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ انکے نام و کام کے تذکرہ سے ماضی گزیدہ اور شخصیتیں ناراض و برہم ہونگی۔ انھیں جان لینا چاہیے کہ تاریخ نے آجتک کسی کو معاف کیا ہے نہ فراموش!

زیادہ ہے کہ ہماری نوخیز نسلیں اور آینوالا زمانہ اس بات کا شدت سے منتظر ہے کہ ان حقائق و واقعات کو ابھار اور نکھار کر سامنے لایا جائے جن سے تحریک

پاکستان کو دوچار ہونا پڑا۔ اور اسلام کے ان منافقوں، اور غداروں کو بے نقاب کر کے انکے سامنے کھڑا کیا جائے۔ جو گاندھوی فلسفہ کے مؤید اور حمایتی بنکر قیام پاکستان کی تحریک کی مخالفت میں پیش پیش رہے۔

"مقدمہ تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء" چوہدری حبیب احمد

الحاصل۔ اس کتاب میں علمائے حق (علمائے اہلسنت) پر نارو اور کیے گئے چند اعتراضات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ اور اسکے ساتھ ہی اُن بے انصافیوں کا بھی ذکر ہے جو جانبدار تذکرہ نگاروں نے علمائے حق پہ روا رکھی ہیں۔

اہل قلم کی بے انصافیاں

جہاد حریت ۱۸۵۷ء اور اسکے قائدین و مجاہدین کے بارے میں ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ لوگ اتنے اونچے اور قد آور تھے کہ تاریخ میں اُنکے نام سنہرے حروف میں لکھے جانے چاہئے تھے مگر اس دور کے اہل قلم اور تذکرہ نگار حضرات نے انکے ذکر میں نہ صرف یہ کہ سخت بے احتیاطی کی ہے بلکہ انتہائی بد دیانتی کے مرتکب بھی ہوئے ہیں ـــــ اس باب میں یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ وہ تذکرہ نگار حضرات جنھیں وفادار سرکار ہونیکی حیثیت سے استبداد کی ان ہولناک تاریکیوں میں تحریر و تقریر کی تمام سہولتیں حاصل تھیں مجاہدین ۱۸۵۷ء کی نہایت ظالمانہ انداز میں کردار کشی کی ہے۔ بلکہ تاریخ کیساتھ ایک ایسا گھناؤنا اور دل آزار مذاق کیا ہے کہ اب اسکا ازالہ ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔

ان حضرات نے اولاً تو جہاد حریت کے جانبازوں کا ذکر ہی نہیں کیا ہے اور اگر کہیں مجبوراً ان کا نام آ بھی گیا تو اس قدر استخفاف اور حقارت سے کام لیا گیا ہے کہ اسکے پڑھنے سے دل لرز اُٹھتے ہیں اور آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں ـــ اگر بنظر تحقیق دیکھا جائے تو قلم ایسے لوگوں کے ہاتھ میں نظر آتے ہیں جنھیں پروردہ سرکار کہا جائے تو کچھ غلط بات نہ ہوگی۔ جو اپنی تمامتر ظاہری ثقاہت کے باوجود عناد اور جانبداری کی کثافت سے آلودہ نظر آتے ہیں

جانبداری کی ان حوصلہ شکن تاریکیوں کے باوجود پورے یقین کیساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب صداقت کی روشنی پھیلے گی اور عناد و جفا کے تہ در تہ گھمبیر بادل وفا و صفا کی دل آویز کرنوں کو تادیر نہیں روک سکینگے۔ اور عظمت کی خود ساختہ بلندیاں زیر و زبر ہو جائیں گی۔

زودفراموش قوم کا فرزند عظیم

اس دردناک نظر اندازی کا شکوہ صرف ہمیں ہی نہیں بلکہ ہر اس اہل علم اور اہل قلم کو ہے جس میں ذرا بھی انصاف و انسانیت کی خو لو باقی ہے۔ چنانچہ جناب رئیس احمد جعفری اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "بہادر شاہ ظفر اور انکا عہد" میں تحریر فرماتے ہیں۔

> مولانا فضل حق علیہ الرحمہ کی شخصیت، سیرت، کردار، اور علم و فضل پر ضرورت تھی کہ ایک مفصل کتاب لکھی جاتی لیکن وہ ایک زُود فراموش قوم کے فرد تھے۔ فراموش کر دیئے گئے اور کچھ دنوں کے بعد لوگ حیرت سے دریافت کرینگے۔ یہ کون بزرگ تھے
>
> (بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد ص۹۵۵ رئیس احمد جعفری)

حقیقت یہ ہے کہ ان عظیم المرتبت لوگوں کی کردار کشی ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت کی گئی ہے اور مجاہدین جنگ آزادی کے مہر و ماہ کیطرح چمکتے دمکتے چہروں پر جس طرح لوگوں نے اپنے دل کی سیاہیاں ملی ہیں اس کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور اب ایک طویل عرصہ گذر جانے کے بعد اس کا کفارہ ادا کرنا ناممکن نظر آتا ہے۔

معاندانہ طرز عمل اس سلسلے میں جناب جعفری فرماتے ہیں۔

> لیکن اس سلسلے میں جو چیز قطعیت کیساتھ نظر انداز کی گئی ہے وہ ہے مجاہدین کا ذکر۔ ذکاءاللہ تک نے اپنی تاریخ میں انھیں "لُچا شہدا" قرار دیا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے، سر سید نے اور دوسرے بزرگان ملت نے جو لکھا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات یا تو ان مجاہدین کے وجود سے ناواقف تھے یا اگر واقف تھے تو نہ صرف یہ کہ انھیں اہمیت نہیں دیتے تھے بلکہ انکے جذبہ اور کردار اور عمل کا استخفاف کرتے رہتے تھے۔ انکے انداز میں اتنی بدردی غیریت اور بر عناد اجنبیت ہے کہ اُسے دیکھکر تعجب ہوتا ہے۔ لیکن خود ان لوگوں نے اور انکے آقایان ولی نعمت یعنی انگریزوں نے دستاویزی ثبوت کو سامنے رکھکر جو حالات لکھے ہیں جو واقعات قلمبند کئے ہیں جن کیفیات کا جائزہ لیا اور تجزیہ کیا ہے انھیں پیش نظر رکھئے تو اُنکے مخالفانہ اور معاندانہ غیر مہذب اور ناشائستہ الفاظ و لب و لہجہ کے باوجود بین السطور سے ان مجاہدین کا روشن بلند اور بے مثال

رشک کردار صاف جھلکتا نظر آتا ہے جیسے تیرہ و تار رات میں بجلی چمک جاتی ہے
جیسے گھنے بادلوں کی اوٹ سے سورج جھانکتا ہے جیسے مایوسیوں کے اندھیروں میں
کوئی کرن پھوٹتی ہے۔

بہادر شاہ ظفر اور انکا عہد ص ۵۱۸

تذکرہ نویسوں کی چشم پوشی

اس باب میں جناب مفتی انتظام اللہ شہابی صاحب کی گواہی بھی دیکھتے چلیں تحریر فرماتے ہیں

ہندوستان کی سیاسی تحریک میں علماء کا جسقدر شاندار کارنامہ اور جذبہ وطنیت کا مظاہرہ ہے اسکی مثال کسی دوسری جگہ نہیں ملتی الیسٹ انڈیا کے اقتدار و تغلب استقلال کے خلاف سب سے پہلے علماء ہی کی آواز مخالف اٹھی انھیں علماء کا پہلا شخص جو سر بکف میدان عمل میں آیا احمد اللہ شاہ مدراسی تھا اسکے ہمنوا کثیر التعداد علماء اٹھے۔ جو ایک طرف درس و تدریس، تصنیف و تالیف میں لگے ہوئے تھے تو دوسری طرف سیاست ملکی میں حصہ لے رہے تھے۔ ان میں نمایاں شخصیت مولانا امام بخش صہبائی شہید مولانا فضل حق خیر آبادی مفتی صدر الدین آزردہ نواب شیفتہ، مولوی عظیم اللہ کانپوری۔ منیر شکوہ آبادی تھے۔ مگر افسوس کہ ان بزرگوں کے سیاسی حالات سے تذکرہ نویسوں نے چشم پوشی کی

(غدر کے چند علماء ص ۳ مفتی انتظام اللہ شہابی)

جوش وہابیت

اس میں قطعاً کوئی شک نہیں کہ ان بزرگان دین کی کردار کشی میں نظریاتی اختلاف کو بہت بڑا دخل تھا۔ چنانچہ جناب رئیس احمد جعفری ندوی ایک مقام پر بطور وضاحت ان جانبدار مصنفین و مؤرخین کے بیدردانہ رویہ کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں

مولانا (جعفر تھانیسری) نے سب کچھ لکھا ہے لیکن رفقاء زندان کے ذکر سے بالکل گریز کیا ہے حالانکہ اس دور میں چوٹی کے مسلمان انکے ساتھ کالے پانی میں ابتلائی زندگی بڑے استقلال و وقار کیساتھ بسر کر رہے تھے۔ حق بات یہ ہے کہ مولانا پر ورہابیت، اور تحریک وہابیت کا جوش اس قدر نمایاں اور غالب تھا کہ وہ اپنے اور اپنی تحریک کے سوا کسی اور چیز کا ذکر کرنا پسند نہیں کرتے تھے (بہادر شاہ ظفر اور انکا عہد صفحہ ۱۳)

غور فرمائیے کہ جہاں انانیت اور خود غرضی، تعصب و تنگ نظری کا یہ عالم ہو، اور جن لوگوں کی خود پسندی اس انتہا کو پہنچ چکی ہو اُن سے اور انکے متعلدین سے کسی مورخانہ دیانتداری کی کیا توقع کیجا سکتی ہے۔ چنانچہ جناب رئیس ہی فرماتے ہیں۔

> سرسید نے محمود خاں کا نام "رنا محمود" اسی طرح شمس العلماء مفتی ذکاء اللہ بخت خاں کو "کم بخت خاں" کے نام نامی اسم گرامی سے یاد کرتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں شکسپیر کے الفاظ میں گلاب کے پھول کو جس نام سے بھی یاد کرو گلاب کا پھول ہی رہیگا
>
> (بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد ص ۸۳۵)

پیدروانہ اندازِ تحریر جناب رئیس احمد صاحب جعفری نے ان صاحبان سیف و قلم کے معاندانہ انداز کی ایک توجیہہ بھی فرمائی ہے جس سے کم از کم یہ ناچیز اتفاق نہیں کر سکتا۔ جناب رئیس فرماتے ہیں۔

> بخت خاں اور مولانا خیر آبادی کے احوال و سوانح، واقعات و حوادث، کارناموں اور سرگرمیوں کی تفصیل معلوم کرنا آسان نہ تھا۔ ان کا ذکر عام دہشت اور سراسیمگی کے باعث اُنکے مداح اور ثنا خواں بھی ڈر ڈر کر اور چبا چبا کر کرتے ہیں۔
>
> آج ہم اندازہ نہیں کر سکتے کہ غدر کا ذکر بھی کتنا روح فرسا تھا اور اُن شخصیتوں کا تذکرہ جنھوں نے اس انقلابی تحریک میں مردانہ وار حصہ لیا تھا اپنی جان سے ہاتھ دھونا تھا انگریزوں کی نازک دماغی بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اور ذرا ذرا سی بات پر اور معمولی سے معمولی شبہے پر جور و ستم کی بارش شروع کر دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان اکابر کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ اور اگر کہیں ملتا بھی ہے تو مخالفانہ اور معاندانہ انداز میں۔
>
> کتاب مذکور ص ۸۳۵

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جنگ آزادی کے اس خونچکا دور میں عظمت کے ان بلند میناروں کا ذکر مصائب و آلام کا ایک پہاڑ توڑ سکتا تھا۔

مگر یہی بات مجاہدین آزادی کی عظمت و برائی کا نشان بن جاتی ہے۔ جنکے ذکر سے استعماری قوتیں لرز اُٹھتی تھیں۔ جنکے نام سے گوروں کے مزاج برہم ہو جاتے تھے۔ جن کی قد آور شخصیتوں کے

سامنے ہمالہ کی چوٹیاں پست نظر آتی تھیں۔ جنکے عزم وجبروت کے سامنے سمندر پار کی مخلوق تھراتی تھی بھلا ایسے لوگوں کو فرنگی اور انکے سایۂ عاطفت میں بیٹھنے والے حاشیہ نشین کسطرح پسند کر سکتے تھے۔

ان مصنفین کیلئے کیا ضروری تھا کہ ان کا استخفاف ہی کرتے اور انکی توہین وتذلیل کو اپنے لئے ذریعۂ نجات بناتے مگر ٹھیرئے ایسا نہ کرتے تو سید احمد سے خاں کسطرح کہلاتے۔ منشی ذکا اللہ سے شمس العلماء مفتی ذکا اللہ کیسے بنتے وظائف کسطرح ملتے۔ جاگیریں کس صلہ میں حاصل ہوتیں۔

حیرت تو یہ ہے کہ آزادی کے اس دور میں بھی انھیں حضرات کی ذریات کا ایک طبقہ صرف نظریاتی اختلاف کیوجہ سے تاریخ سے ہولناک بد دیانتی کر رہا ہے۔

اس کے باوجود روشنی پھیل رہی ہے۔ اور پھیلتی رہیگی تا آنکہ افق افق اجالا پھیل جائے گا آج ہم بیسویں صدی میں ان تحریکات اور حوادث وواقعات کا جائزہ لیتے ہیں تو اس دور کے سوانح نگاروں کے متعلق اچھی رائے قائم نہیں کر پاتے۔

یہاں اسکے علاوہ کیا کہا جا سکتا ہے کہ۔

کبھی تو لائے گی باد صبا پیام ترا   ہوا کے رُخ پہ نشیمن بنائے بیٹھے ہیں

ابن عبدالوہاب اور برطانوی جاسوس ہمفرے

زیر قلم کتاب "پاک وہند کی چند اسلامی تحریکیں اور علماء حق" مکمل ہو چکی تھی کہ "ہمفرے کے اعترافات" نامی کتاب جناب مولانا محمد اللہ یار صاحب اشرفی کی وساطت سے نظر سے گذری اور کتاب میں مزید ایک باب کا اضافہ ہو گیا۔ اگرچہ میں نے اپنی کتاب "پاک وہند کی چند اسلامی تحریکیں اور علماء حق" میں بے شمار شواہد کیساتھ یہ ثابت کر دیا ہے کہ "نجد کی وہابی تحریک" برصغیر کی تحریک جہاد یا دوسرے لفظوں میں "وہابی تحریک" مشرق وسطی کی صیہونی اور بہائی تحریک اور اسی قسم کی دوسری تحریکیں اسلام کے خلاف انتہائی خوفناک اور گھناؤنی سازشیں تھیں جو انکے واقع ہونے سے بھی سالہا سال پہلے ایک طویل منصوبے کے تحت مسلم علاقوں کو غیر مسلموں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔

(مثلاً مدینہ یہودیوں کو، اسکندریہ عیسائیوں کو، یزد پارسیوں کو، عمارہ صابیوں کو، کرمان شاہ علی اللٰہیوں کو، موصل یزیدیوں کو، اور بوشہر سمیت خلیج فارس کے قرب وجوار کے علاقے ہندوں کو

سونپنا.... اور مسقط خوارج کے حوالے کرنا ہی نہیں بلکہ مادی امداد، جنگی ساز وسامان اور فوجی اور سیاسی ماہرین کے ذریعے انھیں مضبوط بنانا بھی ضروری ہے (ہمفرے کے اعترافات ص۱۲۱، ۱۲۲)

ہمفرے کون تھا؟ مختصراً یہ کہ ہمفرے برطانوی سامراج کا ایک منجھا ہوا جاسوس تھا اسکو اور اس جیسے بے شمار افراد کو گورنمنٹ برطانیہ اور اسکے ساتھ ہی دیگر استعماری قوتوں مثلاً روس فرانس وغیرہ نے نو آبادیات قائم کرنے اور انکو استحکام عطا کرنے کیلئے بطور خاص تیار کیا گیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمنوں نے ہمفرے کی یادداشتوں کو "اسپیگل" نامی رسالہ میں شائع کرنا شروع کیا پھر فرانسیسی زبان میں یہ یادداشتیں شائع ہوئیں اسکے بعد ایک لبنانی دانشور نے عربی میں اس کا ترجمہ کیا اور اب یہ "ہمفرے کے اعترافات" کے نام سے اردو میں (انجمن نوجوانان پاکستان گارڈن ٹاؤن لاہور" نے شائع کیا ہے)٭ کتاب پڑھنے سے جہاں سامراجی قوتوں کی درندگی وخونخواری، فریب کاریوں اور عیاریوں کا پتہ چلتا ہے وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کسطرح دنیا بھر میں پھیلی ہوئی مسلم حکومتوں میں بدامنی وخلفشار پیدا کرتے تھے اور یہ کہ یہ لوگ کسطرح اسی ملک کے مقتدر لوگوں کو اپنی مقصد برآری کیلئے استعمال کرتے تھے۔ بلکہ اب بھی کر رہے ہیں۔

ابن عبدالوہاب کی کہانی ہمفرے کی زبانی: یوں تو ابن عبدالوہاب کی کہانی طویل ہی نہیں بلکہ طویل تر ہے اور اسے سلف وخلف نے بڑی وضاحت سے لکھا ہے اور اسکی فطرت وجبلت اور اسکی خونریزی وقساوتِ قلبی کے واقعات بڑی تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ مگر اس برصغیر میں جہاں مرزا قادیانی کو نبی ماننے میں کوئی الجھن محسوس نہیں کی گئی وہیں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اس بدنام زمانہ انگریزوں کے ایجنٹ ابن عبدالوہاب کو امام تک کہنے سے ذرا بھی نہیں جھجکتے۔ انھیں ابن عبدالوہاب کی ہر ادا ایمان افروز اور روح پرور اور شرع محمدی میں شرابور نظر آتی ہے۔

مثلاً جناب مسعود عالم صاحب ندوی اپنی کتاب "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" میں لکھتے ہیں (نجد کی دعوت کے علمبردار شیخ الاسلام محمد ابن عبدالوہاب کی نسبت کرنا ہو تو محمدی کہنا چاہئے.... البتہ عزم وعمل کی مردہ قوتوں کو بیدار کیا، بیجان پیکروں میں زندگی کی حرارت ڈالدی اور پورے خطے کو اسلامی رنگ میں شرابور کردیا یہ ایسا گناہ ہے جسے شاطران فرنگ اور انکے ہوا خواہ معاف نہیں کرسکتے۔ (ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص۱۳)

٭ یہ کتاب مکتبہ فریدیہ سے حاصل کریں۔

اوراب آپ دیکھیں گے انکے شیخ الاسلام کس قماش کے شیخ تھے۔ اور یہ بھی ملاحظہ فرمائینگے کہ انگریزوں کا ہمنوار ہوا خواہ کون تھا۔ اور کن لوگوں کے ساتھ انگریزوں کی گاڑھی چھنتی تھی اور وہ کون لوگ ہیں جنکے آباؤ اجداد (یعنی سید احمد بریلوی، مولوی اسمٰعیل دہلوی وغیرہ وغیرہ نے مسلمانوں پر انگریزوں کو ترجیح دی اور انھیں کے متبعین ومقلدین نے قیام پاکستان کیوقت مسلمانوں پر ہندوں کو ترجیح دی تھی۔ ہمفرے لکھتا ہے کہ بصرہ میں ان دنوں میں ترکھان کی دوکان پر کام کرتا تھا، میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو وہاں آتا جاتا رہتا تھا اور ترکی، فارسی، عربی زبانوں میں گفتگو کرتا تھا وہ ایک اونچا اُڑنیوالا، ایک جاہ طلب اور نہایت غصیلا انسان تھا...... شیخ محمد کے نزدیک حنفی، شافعی حنبلی، مالکی مکاتیب فکر میں سے کسی مکتب کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی وہ کہتا تھا خدا نے جو کچھ قرآن میں کہدیا ہے بس یہی ہمارے لئے کافی ہے (ہمفرے کے اعترافات

انگریزوں کے مقاصد کی تکمیل کیلئے مناسب شخصیت ۔ محمد بن عبدالوہاب سے میل جول اور ملاقاتوں کے ایک سلسلہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ برطانوی حکومت کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کیلئے یہ شخص بہت مناسب دکھائی دیتا ہے۔ اسکی اونچا اُڑنے کی خواہش، جاہ طلبی، غرور، علماء ومشائخ اسلام سے اسکی دشمنی اس حد تک خودسری کہ خلفاء راشدین بھی اسکی تنقید کا نشانہ بنیں۔ اور حقیقت کے سراسر خلاف قرآن وحدیث سے استنادہ اسکی کمزوریاں تھیں جس سے بڑی آسانی سے فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے...... شیخ محمد ابن عبدالوہاب ابوحنیفہ کی تحقیر کرتا تھا اور اسے ناقابلِ اعتبار سمجھتا تھا۔ محمد کہتا تھا میں ابوحنیفہ سے زیادہ جانتا ہوں اسکا دعویٰ تھا کہ نصف صحیح بخاری بالکل لچر اور بیہودہ ہے۔ اعترافات ص۵۱)

ابن عبدالوہاب کی متعہ بازی ۔ عجیب بات یہ ہے کہ ابن عبدالوہاب جسے شیخ الاسلام کا خطاب دیتے ہوئے۔ کچھ لوگوں کی زبانیں نہیں تھکتی ایک برطانوی جاسوس سے بار بار علمی مباحث میں مار کھا جاتا ہے اور متعہ پر راضی ہی نہیں ہوتا بلکہ اسکا عملی مظاہرہ بھی کرتا ہے۔ اب یہاں اسکے علاوہ کیا کہا جاسکتا ہے کہ ع گروہی ابیںت لعنت بردلی۔ ہمفرے لکھتا ہے کہ

جب شیخ متعہ کرنے پر راضی ہوگیا تو اس گفتگو کے فوراً بعد میں اس بدقماش نصرانی عورت کے پاس گیا جو انگلستان کے نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کیطرف سے بصرہ میں عصمت فروشی

پر مامور تھی اور مسلم نوجوانوں کو بے راہ روی پر ابھارتی تھی۔ میں نے اس سے تمام واقعات بیان کئے جب وہ راضی ہوگئی تو میں نے اس کا عارضی نام رکھا۔ اور کہا کہ میں شیخ کو لیکر اسکے پاس آؤں گا۔ مقررہ دن میں شیخ محمد کو لیکر صفیہ کے گھر پہنچا ہم دونوں کے سوا وہاں اور کوئی نہیں تھا محمد نے ایک اشرفی مہر پر ایک ہفتہ کیلئے صفیہ سے عقد کیا مختصر یہ کہ میں باہر اور صفیہ اندر سے محمد بن عبدالوہاب کو اپنے آئندہ کے پروگراموں کیلئے تیار کر رہے تھے صفیہ نے احکام دین کی پامالی اور آزادی رائے کا پرکیف مزہ محمد کو چکھا دیا تھا۔ (ہمفرے کے اعترافات ص۵۵)

ابن عبدالوہاب کی شراب نوشی :۔ یہاں شراب کے بارے میں بھی ہمفرے اور کچھ لوگوں کے شیخ الاسلام کی بحث ہوتی رہی بالآخر ابن عبدالوہاب پانی ملا کر شراب پینے کی حلت پر راضی ہوگیا ہمفرے کہتا ہے (میں نے شراب سے متعلق گفتگو کو صفیہ کے گوش گذار کیا اور اسے تاکید کی کہ موقع ملتے ہی محمد کو نشہ میں چور کر دو اور جتنا ہو سکے شراب پلاؤ۔ دوسرے دن صفیہ نے مجھے اطلاع دی کہ اس نے شیخ کیساتھ جی کھول کر شراب نوشی کی یہاں تک کہ وہ آپ سے باہر ہوگیا اور چیخنے چلانے لگا۔ رات کی آخری گھڑی میں کئی مرتبہ میں نے اس سے مقاربت کی اور اب اس پر نقاہت کا عالم طاری ہے اور چہرے کی آب و تاب ختم ہو چکی ہے خلاصہ کلام یہ کہ میں اور صفیہ پوری طرح محمد پر چھا چکے تھے۔ اس منزل پر مجھے نوآبادیاتی علاقوں کے وزیر کی وہ سنہری بات یاد آئی جو اس نے مجھے الوداع کہتے وقت کہی تھی۔ اس نے کہا تھا ہم نے اسپین کو کفار (مراد اہل اسلام ہیں) سے شراب اور جوئے کے ذریعے دوبارہ حاصل کیا اب انھیں طاقتوں کے ذریعے دوسرے علاقوں کو بھی بامردی کیساتھ لینا ہے۔ کتاب مذکور ص۵۷،۵۸)

ابن عبدالوہاب کی نماز بھی گئی، اور یہودی لڑکی اسکیے متعہ] تارک الصلواۃ متعہ باز شیخ الاسلام، شراب خوری اور متعہ بازی بھی زنا کاری کا جو نتیجہ نکلتا تھا وہ نکل کے رہا چنانچہ ہمفرے لکھتا ہے (جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ اس سے نماز کی پابندی چھوٹ گئی اب وہ کبھی نماز پڑھتا اور کبھی نہ پڑھتا خاص طور سے صبح کی نماز غالباً اس نے ترک ہی کر دی تھی ص۶۰)

پھر ہمفرے لکھتا ہے میں نجف اشرف اور کربلا وغیرہ سے جب بصرہ پہنچا تو وہ ترکی جانے پر بضد تھا کہ وہاں جا کر اس شہر کے بارے میں معلومات کرے میں نے بڑی سختی سے اُسے اس سفر سے باز رکھا اور کہا مجھے ڈر ہے کہ تم وہاں جا کر کوئی الٹی سیدھی بات نہ کر بیٹھو جس سے تم پر الحاد کا الزام عائد ہو

اور ہمارا خون رائگاں جائے۔ لیکن سچی بات یہ تھی کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہاں جاکر وہ بعض علماء اہلسنت سے کوئی رابطہ قائم کرے کیونکہ اس میں اس بات کا خطرہ تھا کہیں وہ لوگ اپنی محکم دلیلوں کے ذریعے دوبارہ اسے اپنے جال میں نہ پھانس لیں ص۷۷)

بالآخر ہمفرے نے ابن عبدالوہاب کو اصفہان جانے پر راضی کرلیا اور اسکے ساتھ ہی کچھ رقم اور ایک گھوڑا بھی دیا۔ اسکے ساتھ ہی صفیہ بھی کچھ عرصہ بعد اصفہان آئی اور اس نے مزید دو مہینے کیلئے شیخ سے متعہ کیا۔ شیراز کے سفر میں وہ اسکے ساتھ نہیں تھی بلکہ عبدالکریم (جو ایک برطانوی جاسوس تھا) نے اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا شیراز میں عبدالکریم نے شیخ کیلئے صفیہ سے بھی زیادہ خوبصورت لڑکی کا انتظام کیا تھا۔ اور وہ شیراز کے ایک یہودی خاندان کی حسین وجمیل لڑکی تھی جسکا نام آسیہ تھا ص۸۱-۸۲)

انگریزوں کا مناسب ترین ایجنٹ ابن عبدالوہاب: ہمفرے لکھتا ہے (محمد پر تسلط نوآبادیاتی وزارت کا سب سے اہم مسئلہ تھا اس نے بڑی شدت سے تاکید کی تھی کہ میں محمد کو ایک منظم منصوبے کے تحت ان امور سے آگاہ کروں جنھیں آئندہ چل کر اسے ہمارے لئے انجام دینا ہے وہ بار بار اس بات کا اعتراف کر رہا تھا کہ عظیم برطانیہ کیلئے میری تمام خدمات شیخ محمد جیسے شخص کی جستجو اور اس پر اپنا اثر و نفوذ قائم کرنے کے مقابلہ میں پاسنگ بھی نہیں ص۸۰) پھر کچھ آگے چل کر ہمفرے لکھتا ہے کہ (میرا سفر صرف اس مقصد کیلئے تھا کہ محمد ابن عبدالوہاب کو نئے دین کے اظہار کی دعوت پر آمادہ کروں ص۱۲۷

دسکریٹری کو اس بات کا یقین ہوچکا تھا کہ محمد ابن عبدالوہاب قابل بھروسہ اور نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کے پروگراموں کو روبعمل لانے کیلئے مناسب ترین آدمی ہے۔ اسکے بعد سکریٹری نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ تمہیں محمد کیساتھ بالکل واضح اور دو ٹوک الفاظ میں گفتگو کرنی ہے، کیونکہ ہمارے عمال اصفہان میں اس سے بڑی صراحت کیساتھ پہلے ہی گفتگو کر چکے ہیں اور وہ انکی باتوں کو مان چکا ہے۔ مگر اس شرط کیساتھ کہ اسے عثمانی حکومت کے مقامی عمال، علماء اور متعصب لوگوں کے ہاتھوں آنیوالے خطرات سے بچا لیا جائے، اور اسکی حمایت اور تحفظ کا بھرپور انتظام کیا جائے ..... حکومت برطانیہ نے شیخ محمد ابن عبدالوہاب کو اسلحے سے اچھی طرح لیس کرنے کے بعد ضرورت کے موقع پر اسکی مدد کی تائید کی تھی اور شیخ ہی کی مرضی کے مطابق جزیرۃ العرب میں واقع نجد کے قریب علاقے کو اسکی حاکمیت کا پہلا مقام قرار دیا تھا ص۱۲۸)

انگریزوں کے چھ خطرناک نکات اور ابن عبدالوہاب :۔ ہمفرے کے اعترافات کے مطابق نوآبادیاتی وزارت نے ابن عبدالوہاب کیلئے چھ نکات مرتب کئے تھے جن پر ابن عبدالوہاب کو ہر صورت عمل کرنا تھا اور یقیناً ابن عبدالوہاب نے عملاً ثابت کردیا کہ وہ قابل بھروسہ ہے اور وہ انگریزوں کے مقرر کردہ ہدف پر بہر حال پورا اُترے گا۔ وہ چھ نکات حسب ذیل ہیں۔

(۱) اسکے (یعنی ابن عبدالوہاب کے) مذہب میں شمولیت اختیار نہ کرنیوالے مسلمانوں کی تکفیر اور انکے مال، عزت اور آبروئی بربادی کی روا سمجھنا، اس ضمن میں گرفتار کئے جانیوالے مخالفین کو بردہ فروشی کی مارکیٹ میں کنیز و غلام کی حیثیت سے بیچنا۔

(۲) بت پرستی کے بہانے بصورت امکان خانہ کعبہ کا انہدام اور مسلمانوں کو فریضہ حج سے روکنا اور حاجیوں کے جان و مال کی غارت گری پر قبائل عرب کو اکساتا۔

(۳)۔ عرب قبائل کو عثمانی خلیفہ کے احکامات سے سرتابی کی ترغیب دینا۔ اور ناخوش لوگوں کو ان کے خلاف جنگ پر آمادہ کرنا۔ اس کام کیلئے ایک ہتھیار بند فوج کی تشکیل، اشراف حجاز کے احترام اور اثر و نفوذ کو توڑنے کیلئے انھیں ہر ممکن طریقے سے پریشانیوں میں مبتلا کرنا۔

(۴) پیغمبر اسلام (صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم) انکے جانشینوں اور کلی طور پر اسلام کی برگزیدہ شخصیتوں کی اہانت کا سہارا لیکر اور اسی طرح شرک و بت پرستی کے آداب و رسوم کو مٹانے کے بہانے مکہ اور مدینہ اور دیگر شہروں میں جہاں تک ہو سکے مسلمانوں کی زیارت گاہوں اور مقبروں کی تاراجی۔

(۵)۔ جہاں تک ممکن ہو سکے اسلامی ممالک میں فتنہ و فساد شورش اور بدامنی کا پھیلاؤ۔

(۶) قرآن میں کمی بیشی پر شاہد احادیث و روایات کی رو سے ایک جدید قرآن کی نشر و اشاعت ص ۱۲۹ ص ۱۳۰) تقریباً ان چھ نکات کی تکمیل کے بعد گورنمنٹ برطانیہ نے سوچا کہ اب سیاسی اعتبار سے بھی جزیرۃ العرب میں کوئی کام ہونا چاہئے یہی وجہ تھی کہ اپنے عمال ہی میں سے محمد ابن مسعود کو محمد ابن عبدالوہاب کیساتھ اشتراک عمل پر مامور کیا ص ۱۲۵) پھر کیا ہوا یہ ایک انتہائی دردناک داستان ہے۔ پورا جزیرۃ العرب خون سے لبریز ہوگیا اور مزارات و مقابر پامالی کر دئے گئے۔ جسے بزرگان دین نے نہایت بسط کیساتھ بیان کیا ہے۔ اور ہم نے اپنی اسی کتاب "پاک و ہند کی چند اسلامی تحریکیں اور علمائے حق" میں کافی حد تک ان مسائل کی وضاحت کی ہے۔

جہاد اور جہادی

جناب سید احمد بریلوی اور انکی تحریک جہاد اور انکے مجاہدین کے بارے میں جہاں تک احوال و واقعات کا تعلق ہے ان میں حقائق کم اور افسانے زیادہ ہیں۔ ان جہادی شخصیات پر جو ڈھیروں مضامین مقالے اور کتابیں لکھی گئیں اور لکھی جارہی ہیں انکے بیشتر واقعات کو زیب داستان سے زیادہ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

آج اس دور میں جب پروپگنڈے اور نشر و اشاعت کے زور پر جناب مودودی صاحب تحریک قیام پاکستان میں قائد اعظم کے شریک سفر کہلا سکتے ہیں۔ اور انکی جماعت پاکستان کی سب سے بڑی جماعت کہلا سکتی ہے۔ اور اسی پاکستان میں جسکے قیام کی سخت ترین مخالفت کرنیوالے مفتی محمود جیسے لوگوں کیلئے "پاکستان کے قائد اعظم مفتی اعظم مفتی اعظم" کے نعرے لگ سکتے ہیں۔ اور جناب حسین احمد مدنی جیسے پاکستان دشمن لوگوں کیلئے پاکستانی ادارہ نشریات سے مدحت سرائی ہو سکتی ہے۔ اور اس ارض پاک کا نمک پانی کھا پی کر "روشن مستقبل" جیسی گمراہ کن کتابیں شائع کیجا سکتی ہیں۔ تو کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔

پروپگنڈے کی خوفناک کہانی محمد علی قصوری کی زبانی

پڑھے لکھے لوگوں کیلئے مولانا محمد علی قصوری کوئی غیر معروف شخصیت نہیں ہیں مولوی ہونے کیساتھ ساتھ وہ کیمبرج کے تعلیم یافتہ تھے۔ مسلکا اہلحدیث تھے۔ اور خود لبعد کے مجاہدین عزیز کی شامل تھے اسلئے انکی کہی ہوئی بات بڑی حد تک وقعت و اہمیت رکھتی ہے۔ پروپگنڈے کی کہانی انکی کتاب "مشاہدات کابل و یاغستان" میں ص۱۱۹ سے ص۱۲۱ تک پھیلی ہوئی ہے جسکے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں اور اندازہ کریں کہ یہ دینی اور مذہبی لوگ اس باب میں کہاں تک جا پہنچے ہیں۔

۱۔ گو جماعت مجاہدین کا مرکز مردہ ہو چکا تھا مگر اسکے پروپگنڈہ کا نظام ابھی تک بہت وسیع اور عمدہ تھا جسکا نتیجہ یہ تھا کہ سید سے سادے مسلمان جنھیں کتاب و سنت کیساتھ عشق ہوتا تھا اس پروپگنڈا کا آسانی سے شکار ہوتے تھے ص۱۱۹

۲۔ جماعت مجاہدین کے موسسین نے شروع سے جماعت کے قیام و بقا کیلئے ایسا منظم سسٹم بنایا تھا کہ انگریزوں کا تشدد اور غدر کے مقدمات بھی اس نظام کو نہ توڑ سکے۔ چنانچہ ہندوستان میں جگہ جگہ مختلف ادارے تھے جو بظاہر تعلیمی مشاغل میں منہمک تھے اور مدرسوں کے اور خیراتی اداروں کے ذریعہ کافی رقم جمع کرتے تھے۔ اس رقم کا ایک معتد بہ حصہ سرحد پار امیر المجاہدین کے پاس جہاد کیلئے پہنچ جاتا تھا ص ۱۱۹۔

مگر تعجب یہ ہے کہ باوجود اس قدر امین اور بے غرض ہونے کے وہ جماعت کیلئے حیرت انگیز جھوٹا پروپگنڈہ کرتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انسان اضداد کا پتلا ہے۔ یہ تضاد میں نے اکثر بہترین کمیونسٹ ورکروں میں بھی دیکھا ہے۔

اور مجھے حیرت ہوتی ہے ایک بے غرض ایثار کا پتلا امین و دیانتدار شخص کیونکر ایسی جماعت کیلئے بے دریغ جھوٹا پروپگنڈا کرنے سے نہیں جھجکتا بلکہ اسے عین ثواب سمجھ کر کرتا ہے ص ۱۲۱

(مشاہدات کابل و یاغستان از ص ۱۱۹ تا ص ۱۲۱)

اسکے بعد بھی ان لوگوں کے غلط پروپگنڈوں کی بابت بہت کچھ لکھا ہے۔ مثلاً یہی کہ میرا نام لے کر ہندوستان پر فوری حملہ کے متعلق بڑا غلط پروپگنڈا کرتے تھے اور خوب جی بھر کے چندہ جمع کرتے تھے ـــــ ان حضرات کی بلکہ یہی عادت اب بھی ہے دوسرے لوگوں کے خلاف دل کھول کر غلط پروپگنڈا کرتے ہیں اور سال بھر چندہ جمع کرتے رہتے ہیں۔

بہرصورت جو دیوبند پاکستان کا دشمن اول تھا اسکے جشن کے سلسلے میں لاہور کا اسٹیشن سجایا جا سکتا ہے۔ (جبکہ اس کی صدارت بھی اندرا گاندھی نے کی) خصوصی ٹرینیں چلائی جا سکتی ہیں۔ بطور خاص اجازت نامے مرحمت فرمائے جا سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ ع اگر گویم زباں سوزد

یہاں تک کہ پروفیسر عبد القیوم صاحب نے اپنے مضمون "تجدید و احیائے ملت" میں تو گویا مولوی محمد اسمٰعیل صاحب دہلوی کو پاکستان کا پہلا مصور قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

> نجد میں امام عبد الوہاب کی کامیابی نے شاہ اسمٰعیل کی ہمت و جرأت اور بھی بڑھا دی میدان جنگ منتخب ہوا قرعہ فال بالاکوٹ کے نام نکلا۔ ہندوستان بھر کے مجاہدین

وہاں جمع ہونے لگے اور اپنے آباؤ اجداد کے خیالات کے مطابق شاہ اسمعیل ہندوستان میں "پاکستان" یعنی خلافت اسلامیہ کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے۔

(از امتیاز حق صفحہ ۹۰) (شاہ اسمعیل شہید ۱۴۲)

حالانکہ علمائے دیوبند کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ وہابیان نجد سے شاہ اسمعیل کا تعلق ثابت نہ ہو سکے۔

بہرصورت ان حضرات کی پیش قدمی کا یہی حال رہا تو عنقریب آپ ان مورخین و مقلدین کو یہ کہتے ہوئے پائینگے کہ "پاکستان" بنایا ہی سید صاحب اور شاہ اسمعیل نے تھا۔ پھر آپ کیا کرلینگے۔ آپکے سر پر تو تلوار لٹک رہی ہے۔ آپ کا سینہ تو دہکتی گولیوں کے سامنے ہے۔

بالکل اسی طرح جسطرح نظریۂ پاکستان کا جھٹکا کر دیا گیا تھا۔ اور اوپر سے نیچے تک محب وطن کہلانے والے لوگ نہایت صبر و تحمل کیساتھ نظریۂ پاکستان کی پامالی کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔

مولوی محمد اسمعیل صاحب دہلوی اور سید احمد صاحب بریلوی کے متبعین و مقلدین کے کردار قیام پاکستان کے بارے میں کس سے پوشیدہ نہیں، ہر تاریخ داں یہ جانتا ہے کہ اس مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والوں نے مسلمانوں پر فرنگیوں کو ترجیح دی تھی۔ اور علمائے دیوبند نے مسلمانوں پر ہندوؤں کو ترجیح دی ہے۔ پہلے دہلی کی مسلمان کمزور حکومت کو مضبوط کرنا خلاف شریعت اور غلط تھا۔ اور بعد میں اسلامی حکومت کا قیام و استقلال اس سے کہیں زیادہ غلط اور نادرست ہوا صحیح کیا تھا۔؟ جو یہ بزرگان دین و ملت سوچتے اور کرتے تھے!

تضادات

دوسرے مسائل کیطرح اس مسئلہ جہاد میں بھی ان حضرات کے بیان کردہ احوال و واقعات میں اتنا زبردست تباین اور تضاد پایا جاتا ہے کہ کوئی بھی ذی فہم قاری ذہنی خلش میں مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حتیٰ کہ یہ مورخین حضرات آج تک یہ فیصلہ بھی نہ کر سکے کہ سید صاحب اور انکے ساتھیوں کے جہاد کا رخ کدھر تھا۔

اور یہ جہاد انگریزوں سے تھا یا سکھوں سے یا سرحد کیطرف صرف تبلیغی دورہ تھا۔ اور یہ کہ سکھوں اور انگریزوں سے پہلے پٹھانوں کو کچل دینا کیوں ضروری تھا؟

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس سلسلے کے بہت سے اہم مسائل ہیں بعد والوں نے

پہلوں کی، بلکہ اخلاف نے اپنے اسلاف کی، اصاغرین نے اپنے اکابرین کی، تلامذہ نے اپنے اساتذہ کی تکذیب و تضحیک کی ہے جسکی وجہ سے ان حضرات کی تحریریں مشتبہ اور ناقابل قبول ہو جاتی ہیں۔

دور حاضر کے محققین نے تحریک جہاد کے باب میں جہاں پہلوں کی تکذیب کی ہے۔ وہیں اپنی تخلیق کی بنیاد غیر مطبوعہ قلمی نسخوں، نایاب دستاویزات اور ایسے مکتوبات پر رکھی ہے جہاں تک کسی غیر کی رسائی تقریباً ناممکن ہے۔

اور حدیہ ہے کہ پہلے تذکرہ نگاروں پر جو قرب زمانہ اور شریک حال ہونیکی وجہ سے ماخذ قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ اُن پر تحریف کا الزام لگایا جا رہا ہے (حالانکہ وہی حضرات ان نئے مورخین سے پہلے بلکہ ابتک معتمد اور ثقہ سمجھے) ان حالات میں دور حاضر کے سوانح نگاروں کی باتیں کسطرح قابل قبول ہو سکتی ہیں۔ جبکہ یہ مؤرخین حضرات بھی اُنھیں کیطرف رجوع کرتے ہیں۔ ویسے بھی قدیم معتمد لوگوں کو جھٹلانا بڑا غلط رحجان ہے۔

دلچسپ باتیں

یہاں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ آجتک جتنے بھی سید صاحب کے مؤرخین گذرے ہیں تقریباً سبھوں نے سید صاحب کی علمی کم مائگی اور پڑھنے لکھنے میں عدم رغبتی کا اقرار کیا ہے۔ جناب شیخ اکرام لکھتے ہیں۔

> مولانا سید احمد ۲۹ نومبر ۱۷۸۶ء کو رائے بریلی میں پیدا ہوئے اُن کی ابتدائی زندگی پردۂ راز میں ہے لیکن اتنا معلوم ہے کہ ایام طفلی میں تحصیل علم سے آپکو رغبت نہ تھی اور مکتب میں تین چار سال گذارنے کے بعد قرآن مجید کی چند سورتوں کے سوا آپکو کچھ یاد نہ ہوا۔
>
> (موج کوثر ص۱۵)

جوانی میں آپ دہلی تشریف لے گئے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب علیہ الرحمہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُنھوں نے شاہ عبدالقادر صاحب کے پاس بھیجدیا۔

> وہاں آپ نے کچھ عرصہ صرف ونحو پڑھی قرآن مجید کا اردو ترجمہ بھی مطالعہ کیا۔ لیکن پڑھنے لکھنے میں کوئی نمایاں ترقی نہ کی
>
> (حوالہ مذکور)

جناب ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں

جب آپکی عمر ۴ سال کی ہوئی تو شرفا کے دستور کے مطابق آپ مکتب میں بٹھائے گئے لیکن لوگوں نے تعجب سے دیکھا کہ آپکی طبیعت خاندان کے اور لڑکوں اور اپنے ہم عمروں کے برخلاف علم کیطرف راغب نہیں اور آپ پڑھنے پڑھانے کیطرف توجہ نہیں کرتے۔ تین سال مکتب میں گذر گئے اور باوجود استاد کی توجہ و شفقت اور بزرگوں کی تاکید و فہمائش کے صرف قرآن مجید کی چند سورتیں یاد ہو سکیں اور مفرد مرکب الفاظ لکھنا سیکھ گئے۔

سیرت سید احمد شہید ص ۸۹ جلد اول

اور اب مرزا حیرت کی بھی سنئے۔

کریما کا پہلا مصرعہ خاص دعائیہ ہے مگر یہ بھی بزرگ سید کو تین دن میں یاد ہوا تھا اس پر بھی کبھی کریما بھول گئے تو کبھی بسر حال ما کو دل سے محو کر دیا۔۔۔ میاں جی نے بتہر اسر پٹکا اور مغز پچی کی بزرگ سید کے کان پر جوں بھی نہیں رینگی۔

(حیات طیبہ جز دوم ص ۲۳۶)

مگر "مسلمانوں کا روشن مستقبل" کے عظیم مصنف جناب سید طفیل منگلوری ایک اور ہی داستان سناتے ہیں۔

سید صاحب بہت ذہین تھے اور انکی علمی ترقی کی رفتار بہت تیز تھی۔ مگر ان میں روحانیت بڑھی ہوئی تھی اس لئے درس چھوڑ کر انھیں طریقت کی تعلیم دی گئی۔

("مسلمانوں کا روشن مستقبل" ص ۱۲۷)

پوچھنا صرف یہ ہے کہ کیا یہ بھی کوئی ایسا مسئلہ تھا جس میں اختلاف رائے ہوتا۔ ان حوالوں کے پیش نظر جہاں تک ایک قاری سمجھ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر مصنف نے جو سمجھ میں آیا لکھدیا اور حقیقت حال کیا ہے؟ اسکو سمجھنے، پرکھنے کی کوشش نہیں کی گی۔

پھر یہ کہ دیگر مسائل کیطرح ان حضرات نے تاریخ میں بھی "قانون ضرورت" کو ترجیح دی ہے۔ یعنی جب ضرورت تھی کہ یہ کہا جائے کہ سکھوں سے جنگ تھی تو کہدیا گیا کہ ان لانبے بالوں والے

سکھوں سے جنگ تھی۔ اور جب سکھ بھی ہندوں کیطرح برادران وطن بن گئے۔ اور انگریزوں سے ٹھن گئی تو کہدیا گیا جنگ انگریزوں سے تھی۔ سکھوں کا نام بلا وجہ درج کردیا گیا ہے۔ اور اسے زیادہ گاڑھا کرنا ہوا تو کہا گیا "مرموز" طریقہ استعمال کیا گیا ہے یعنی سکھ بول کر انگریز مراد تھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

بہرصورت اس باب میں ہمارا موقف غیر مبہم اور نقطۂ نظر واضح ہے۔ کہ سید صاحب اور انکے ساتھیوں کا مقصد نجدی طرز پر "وہابی اسٹیٹ" کا قیام تھا جنکی تائید سید صاحب کے مورخین بھی فرماتے ہیں حق یہ ہے کہ انگریزوں سے انھوں نے ایک دن بھی جنگ نہیں کی (جسکا تفصیلی جائزہ آگے آرہا ہے)

سکھوں سے بھی با امر مجبوری جنگ ہوئی۔ البتہ شروع سے آخر تک سرحدی پٹھانوں پر بدعت اور شرک و کفر کے فتوے لگاتے رہے اور اُن سے جنگ وجدال بنام جہاد کرتے رہے۔ اور غیور پٹھانوں کی بہو بیٹیوں سے قوت اور ہتھیاروں کے زور پر زبردستی نکاح کا شوق پورا فرماتے رہے۔

مولوی اسمٰعیل کا عزم خونریزی

سرحدی مسلمانوں کے لئے مولوی اسمٰعیل کے عزائم انتہائی خطرناک تھے۔ اُنکے مورخین کے بقول وہ کھلی اور ننگی تلوار تھے۔ مگر سید صاحب کی مصلحت اندیشی آڑے آتی تھی۔ یا یوں کہہ لیں کہ سید صاحب کی فوج میں ہر قسم کے لوگ تھے جسکی وجہ سے مولوی اسمٰعیل کھلم کھلا اپنے عزائم کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتے تھے جیسا کہ طفیل منگلوری لکھتے ہیں۔

> واقعہ یہ ہے کہ وہ جماعت "مختلف اور متضاد گروہوں سے مرکب تھی جنھیں متحد رکھنے میں وہ مدت العمر مساعی رہے ان میں سے ایک گروہ کے سردار مولوی عبدالحی اور مولوی کرامت علی جونپوری تھے جو اہلسنت کا طریقہ رکھتے تھے اور دوسرے گروہ کے سردار مولوی اسمٰعیل تھے جو چاروں اماموں کی تقلید سے آزاد تھے اور براہ راست حدیث کو اپنا ماخذ قرار دیتے تھے خود سید صاحب عمل کے اعتبار سے حنفی تھے مگر ساتھ مولوی اسمٰعیل کی جماعت کی سرپرستی کرتے تھے جو اپنے کو محمدی کہتے تھے۔
>
> (مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۱۲۸)

مولوی اسمٰعیل دہلوی کے خوفناک عزائم کا پتہ اُس خط سے اچھی طرح واضح ہوجاتا ہے جو اُنہوں نے جمادی الاول ۱۲۴۶ھ میں سید صاحب کو ایک تفتیش کے سلسلے میں لکھا تھا۔ یہاں مکتوبات سید احمد شہید

سے انکے ترجمے کا اقتباس درج کیا جاتا ہے جو سخاوت مرزا نے کیا ہے۔

> میں نے ایک پرچہ لکھ کر خدمت عالی میں ارسال کر دیا ہے۔ جو اللہ نے چاہا تو جناب کے ملاحظہ سے گذرے گا لیکن اس موقع پر ذرا تامل سے کام لینا چاہئے کیونکہ یہاں دو معاملے درپیش ہیں۔
> ایک تو مفسدوں اور مخالفوں کے ارتداد کا ثابت کرنا اور قتل وخون کے جواز کی صورت نکالنا اور انکے اموال کو جائز قرار دینا ــــ اس بات سے قطع نظر کر وہ انکے ارتداد پر یا انکی بغاوت پر مبنی ہے دوسرے یہ کہ اسکا آیا کوئی سبب ہے۔ یا کچھ اور ہے۔ جبکہ بعض اشخاص کے مقابلہ میں انکا مرتد ہونا ثابت ہو چکا ہے۔ اور بعض کے متعلق بغاوت یا اسکا کوئی اور سبب اگرچہ کہ پہلا طریقہ ہمارے پاس وہی یعنی تحقیق وتفتیش کرنا ہے۔ کیونکہ ہم ان فتنہ پردازوں کو فی الحقیقت مرتدوں بلکہ اصل کافروں میں شمار کرتے ہیں اور انکو اہل کتاب کافروں کے مثل جانتے ہیں۔
>
> مکتوبات سید احمد شہید صہ ۲۴

عبارت کی پیچیدگی کے باوجود یہ بات واضح طریقہ سے سمجھ میں آتی ہے کہ ان کے کفر وارتداد میں شک وشبہ نہیں، اور قتل وخون ریزی کے جواز میں کوئی تامل نہیں۔ تامل صرف اس بات میں ہے کہ ان اسباب کو تلاش کیا جائے جنکی وجہ سے انکے اندر متابعت سے اعراض کی جرأت پیدا ہوئی ورنہ ان کا ارتداد اور انکا کافر ہونا ثابت ہے انکو قتل کیا جاسکتا ہے اور انکے مال ومتاع کو لوٹنا درست ہے۔

> اب رہا آتمان زئی کا معاملہ تو اس کا واقعہ یہ ہے کہ پشاور کے سرداروں کے ممالک میں اس میں کوئی شک نہیں کہ طرح طرح کا ظلم، فسق وفجور اور جاہلیت کی رسمیں رائج تھیں جو ابتک موجود ہیں اور ایسی ہر مملکت میں جہاں ایسی فتنہ پردازیاں ہوں تو اس ملک پر لشکر کشی کرنا امام کیلئے جائز ہے اور اس سلطنت کو درہم برہم کر دینا ثواب کا کام ہے۔
>
> مکتوبات سید احمد شہید صہ ۲۴۳

مولوی اسمٰعیل صاحب کا رویہ ابتداہی سے انتہائی جارحانہ رہا ہے اور اس کی دلیل خود ان کی کتاب تقویۃ الایمان ہے جس میں دنیا کے کسی فرد کو صاحب ایمان نہیں رہنے دیا گیا ہے (تفصیل آرہی ہے)

وہابیوں کی کہانی کنہیا لعل کی زبانی

سچ یہ ہے کہ اس دور میں جسے جدید مورخین" دور اول" کا نام دیتے ہیں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا جس سے معلوم ہو کہ سید صاحب اور مولوی اسمٰعیل صاحب نے انگریزوں سے جنگ کی ہو۔ اس باب میں کنہیا لعل کی بات قدرے واضح ہے۔

(تاریخ پنجاب مصنفہ کنہیا لعل ۱۸۸۱ء) وہ اپنی اس کتاب میں واقعات جہاد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> سید صاحب نے پشاور پر یورش کی سردار محمد خان نے بحالت ناچاری اسکی اطاعت قبول کی اور اس نے اپنا عمل دخل پشاور میں کر کے سردار سلطان محمد خان کو اپنی نیابت پر مقرر کیا اور قاضی و مفتی وہابی مذہب کے شہر میں مامور کر دیئے یہ سید احمد سرگروہ فرقہ وہابیہ کا تھا اور اس سے اول یہ ہندوستان سے باتفاق مولوی محمد اسمٰعیل کے عرب کو گیا اور علاقہ نجد میں رہ کر وہابیہ مذہب کی تعلیم پائی۔ پھر یہ ہندوستان میں آیا اور چاہا کہ بوسیلہ جہاد کے مجمع جمع کر کے کسی علاقہ کی ریاست حاصل کرے اس ارادے پر اس نے بہت روپیہ جمع کیا اور قریب چار ہزار جہادی لوگ مجتمع کر کے پہاڑ پہاڑ ہو کر پشاور کے علاقہ میں سر آنکلا۔ بظاہر اس کا خیال تھا کہ میں کنارے سے جنگ کر کے مسلمانی دین کو پھیلایا چاہتا ہوں چنانچہ اس نے پشاور فتح کر کے بہت جمعیت اپنے ساتھ کرلی علاقہ یوسف زئی کے پٹھان بھی اسکے ساتھ بے شمار شامل ہو گئے تھے۔
>
> (تاریخ پنجاب ص۲۲۳)

اس واقعہ کو بطور وضاحت سردار سلطان خان محمد کی زبانی بھی سن لیں۔

> پہلے یہ شخص کلکتہ کو گیا اور وہاں سے جہاز میں بیٹھ کر خانہ کعبہ کو گیا اور وہاں نجد کے وہابی علماء بہت آئے ہوئے تھے اُن سے اس کی ملاقات ہوئی اور وہ یہاں تک اس پر غالب آئے کہ اپنے مذہب میں اسکو ملالیا۔ اور اس نے بھی اپنے تمام ہمراہیوں کو اس مذہب کی پابندی میں داخل کر لیا۔ اور وہاں سے پکا وہابی ہو کر پھر ہندوستان میں آیا۔ اور مشہور کیا کہ میں جہاد کرنے پر مستعد ہوں ہر ایک علماء کو چاہئیے کہ مال و جان سے میری امداد

کرے۔ ہر ایک مسلمان رئیس کے پاس یہ خود گیا اور زر کثیر بہ بہانہ جہاد وصول کیا بہت سے مسلمان جان دینے کیلئے اسکے ساتھ ہو گئے۔

چونکہ اصل مقصد اُسکا یہ تھا کہ کسی بے انتظام علاقہ میں جاکر ریاست حاصل کرے اور دائی ملک بنجائے اسواسطے یہ گوشہ اُس نے اپنی خواہش کے مطابق پایا اور پہاڑ کے راستہ پشاور کے علاقہ میں آپہنچا۔

(تاریخ پنجاب صـ ۳۲۷)

اسکے بعد سکھوں کی فوج پشاور پہنچی تو یہ پشاور خالی کر کے پہاڑوں پر چڑھ گئے۔ عرصہ تک سکھوں کی فوج پشاور میں رہی مگر سید صاحب اور انکے غازی بلند و بالا پہاڑوں سے نیچے نہیں اُترے اور جب سکھوں کی فوج واپس ہو گئی تو۔

سید احمد جہادی نے پھر پشاور کا میدان خالی پایا فی الفور یوسف زئیوں کے علاقہ سے نکلکر پشاور پر یورش کی سلطان محمد کے پاس اپنی ذاتی فوج بہت کم تھی اس نے اطاعت مان لی تو سید احمد اپنی مراد کو پہنچ گیا تمام علاقہ میں اپنے کاردار پہنچوا دئے۔ سردار سلطان محمد خاں کو اپنی نیابت عطا کی اور خود انتظام عرصہ دو ماہ کر کے بارادہ فراہمی فوج یوسف زئیوں کیطرف چلا۔ مگر وہاں جاکر اسکی تدبیر مخالف پڑی کہ اس نے بیباک ہو کر بخلاف مذہب اہلسنت وجماعت تمام لوگوں کو اپنے وہابیہ مذہب میں داخل کرنا چاہا اور برملا ممبر پر بیٹھ کر وعظ کیا کہ کوئی مسلمان کسی مقبرہ پر نہ جائے اسکو وسیلہ پکڑ کر دعا نہ مانگے اور اپنے بڑے بزرگوں کی ارواح کو کچھ نہ دیوے انکو ہرگز نہیں پہنچتا۔

یہ مسائل جب اپنے مذہب کے برخلاف لوگوں نے سنے تو حیران رہ گئے اور ملاؤں سے حال دریافت کیا چونکہ ملاں لوگوں کا اس میں کمال نقصان تھا انہوں نے مل کر تمام علاقہ کو سید صاحب کا دشمن بنا دیا۔

علاوہ اسکے مشائخ، بزرگ، عابد و خدا پرست لوگ اس علاقہ کے سید احمد کے ایسے جانی دشمن بنے کہ اسکے حق میں کفر کا فتویٰ دیا اور کہا کہ یہ سید احمد وہابی اولیا کی کرامت کا منکر ہے آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ یوسف زئیوں نے اس کو بزور شمشیر اپنے علاقہ سے نکال دیا

> اور اسکی صورت سے بیزار ہو گئے ۔ جب یہ حال پشاور میں مشہور ہوا تو شہر والوں نے ہجوم کر کے اسکے اہلکار شہر سے باہر کر دیئے ۔
>
> تاریخ پنجاب صـ ۳۲۸

گوروں کی سرپرستی

مذکورہ بالا احوال وواقعات سے جہاں بنیادی نقطۂ نظر کے اختلاف کا اظہار ہوتا ہے وہیں جناب سید احمد بریلوی اور ان کے رفقائے کار کے عزائم کا بھی پتہ چلتا ہے ۔ جانبدار مصنفین کی ہزاروں پردہ پوشیوں کے باوجود یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ان حضرات کا اصل مقصد ومدعا وہابیت کا فروغ اور وہابی حکومت کا قیام تھا جسے نئے مورخین "حکومت الٰہیہ" کے خوبصورت نام سے یاد کرتے ہیں ۔

ہمارے نزدیک انکا انگریزوں سے جہاد خارج از بحث ہے انگریز اتنے بیوقوف کبھی بھی نہیں تھے کہ ان حضرات کو منظم اور مسلح کر کے کہتے "آبیل مجھے مار" بلکہ انگریزوں نے اپنے مقاصد کی تکمیل کیلئے انھیں استعمال کیا اور یہ حضرات استعمال ہو گئے بالکل اسی طرح جیسے ہندوں نے اپنے مقاصد کی تکمیل کیلئے انھیں استعمال کیا اور یہ استعمال ہو گئے بلکہ ہو رہے ہیں جیسا کہ طفیل احمد منگلوری اپنی کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" میں تحریر فرماتے ہیں ۔

> اب سوال یہ ہے کہ گورنمنٹ انگریزی نے اسوقت یہ کیوں گوارا کیا کہ تمام ہندوستان میں جہاد کیلئے سامان جنگ اور روپیہ فراہم ہوتا ہے ۔ اور گورنمنٹ کیطرف سے نہ صرف اسکی اجازت ہو بلکہ مجاہدین کو ہر قسم کی امداد دی جائے اور انکا روپیہ وصول کر کے انھیں دیا جائے اسکا جواب حسب ذیل اقتباس میں ملے گا ۔
>
> اس میں شک نہیں کہ اگر سرکار اسوقت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف ہوتی تو ہندوستان سے سید صاحب کو کچھ بھی مدد نہ پہنچتی ۔ مگر سرکار انگریزی اسوقت دل سے چاہتی تھی کہ سکھوں کا زور کم ہو ۔
>
> (مسلمانوں کا روشن مستقبل صـ ۱۳۴)

غور فرمایئے کہ اس عبارت سے کیا کیا نتیجے اخذ کئے جاسکتے ہیں ؟ اور تقریباً یہی بات جناب مولوی محمد جعفر تھانیسری بھی لکھتے ہیں ۔

اس سوانح اور مکتوبات کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سید صاحب کا انگریزی سرکار سے جہاد کرنیکا ہرگز ارادہ نہ تھا ۔ وہ اس آزاد عملداری کو اپنی ہی عملداری سمجھتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ انگریزی سرکار اسوقت سید صاحب کے خلاف ہوتی تو ہندوستان سے سید صاحب کو کچھ بھی مدد نہ پہنچتی ۔ مگر سرکار انگریزی اسوقت دل سے چاہتی تھی کہ سکھوں کا زور کم ہو ۔

(حیات سید احمد شہید ص۲۹۳ جعفر تھانیسری)

چنانچہ جو اعلامیہ سید صاحب کیطرف سے بطور امیر المومنین کے جاری ہوا اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ جنگ انگریزوں سے نہیں سکھوں سے تھی ۔

نہ تو ہم کو مسلمان امرا میں سے کسی کے ساتھ تنازعہ ہے اور نہ کسی مسلمان رئیس سے مخالفت ہے ہمارا مقابلہ کنار نشینوں سے ہے نہ مدعیان اسلام سے ۔ بلکہ صرف لانبے بالوں والے سکھوں سے ہماری جنگ ہے کلمہ گویوں اور اسلام کے طالبوں سے نہیں اور نہ سرکار انگریزی سے ہمکو کوئی مخاصمت ہے اور نہ کوئی جھگڑا ہے کیونکہ ہم تو اسکی رعایا ہیں ۔ بلکہ ہمکو تو اس کی حمایت میں رعایا کے مظالم کا استیصال کرنا ہے

(مکتوبات سید احمد شہید مترجم سخاوت مرزا ص۲۲)

اور جناب طفیل احمد منگلوری سوانح احمدی کے حوالے سے لکھتے ہیں

اور سرکار انگریزی گو منکر اسلام ہے مگر مسلمانوں پر ظلم و تعدی نہیں کرتی اور نہ انکو فرض مذہبی اور عبادت لازمی سے روکتی ہے پھر ہم سرکار انگریزی پر کس سبب سے جہاد کریں اور خلاف اصول مذہب طرفین کا خون بلاسبب گرادیں ۔

مسلمانوں کا روشن مستقبل ص۱۳۳

یوں تو انگریزوں کی سرپرستی کی داستان بہت طویل ہے ۔ اس جہاد میں قدم قدم پر انگریزوں نے سید صاحب اور انکے مجاہدین سے بھرپور تعاون کیا ہے ۔ جیسا کہ یہی منگلوری صاحب سرسید کے حوالے سے لکھتے ہیں ۔

اس زمانہ میں علی العموم مسلمان لوگ عوام کو سکھوں پر جہاد کرنیکی ہدایت کرتے تھے

ہزاروں مسلح مسلمان اور بے شمار سامانِ جنگ کا ذخیرہ سکھوں پر جہاد کرنیکے واسطے جمع ہوگیا مگر جب صاحب کمشنر اور صاحب مجسٹریٹ کو اسکی اطلاع ہوئی تو انھوں نے گورنمنٹ کو اطلاع دی گورنمنٹ نے صاف لکھا کہ تم کو دست اندازی نہیں کرنی چاہیے دہلی کے ایک مہاجن نے جہادیوں کا روپیہ چھین لیا تو ولیم فریزر کمشنر دہلی نے ڈگری دی جو وصول ہو کر سرحد بھیجی گی۔

(حوالہ مذکور ص ۱۴۲)

ان مندرجات کی روشنی میں کوئی شخص اسکے علاوہ کیا سوچ سکتا ہے کہ ان مجاہدین کا فرنگیوں سے گہرا رابطہ تھا یہی وجہ ہے کہ "جہاد پر جانے سے قبل سید صاحب نے شیخ غلام علی رئیس الہ آباد کی معرفت نواب لفٹیننٹ گورنر کو ارادۂ جہاد کی اطلاع دی جواب ملا کہ جب تک انگریزی عملداری میں کسی فتنہ و فساد کا اندیشہ نہ ہو ہم ایسی تیاری کے مانع نہیں"

اور تقریباً یہی بات مولانا حسین احمد صاحب مدنی بھی فرماتے ہیں اور انکی تحریر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں نے سید صاحب کیساتھ بھرپور تعاون کیا تھا نقش حیات میں لکھتے ہیں کہ

"جب سید صاحب کا ارادہ سکھوں سے جنگ کرنیکا ہوا تو انگریزوں نے اطمینان کا سانس لیا اور جنگی ضرورتوں کا سامان مہیا کرنے میں سید صاحب کی مدد کی"

یہی نہیں بلکہ سید صاحب کے تعلقات انگریزوں سے اتنے گہرے تھے کہ عین زمانہ جنگ میں جب راجہ رنجیت سنگھ نے حکیم عزیز الدین اور سردار وزیر سنگھ کو سفیر مقرر کیا۔

اور پیام صلح دیکر سید صاحب کیطرف بھیجا صلح کی شرط راجہ رنجیت سنگھ نے یہ پیش کی کہ دریائے اباسین سے بائیں طرف کا ملک جو سید صاحب کے قبضے میں ہے اُنکے قبضے میں رہے اور وہ دائیں طرف کا قصد نہ کریں راجہ رنجیت سنگھ کی اس سفارت کا جواب سید صاحب نے مولوی خیر الدین شیرکوٹی اور حاجی بہادر خاں کے ہاتھ بھیجا وہ سب سے پہلے جنرل ونٹورا کی ملاقات کو گئے۔

جنرل ونٹورا نے ڈپلومیسی کا جال پھیلایا اور کہا کہ جسوقت میرا ڈیرا حضرو میں تھا اسوقت ایک شخص بطور سفیر خلیفہ صاحب (یعنی حضرت مولانا سید احمد بریلوی) کیطرف سے میرے

پاس آیا تھا اور کہتا تھا کہ اگر راجا رنجیت سنگھ خلیفہ صاحب کی معرفت (مالگذاری) ملک یوسف زئی کی کیا کریں تو سرکار خالصہ تکلیف فوج کشی اور زیرباری سے رہائی پائے اور اس ملک کے آدمی تاراجی اور آتش زنی سے مخلصی پائیں سو یہ بات مجھکو بہت پسند آئی۔

جنرل ونٹورا کی چال بہت گہری تھی اسکی کوشش یہ تھی کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے

(موج کوثر ص۲۷ شیخ محمد اکرام)

اسکے بعد جنرل ونٹورا اور سید صاحب کے سفیروں کے درمیان کچھ تلخ باتیں ہوئیں اور یہ سفارت رنجیت سنگھ کے پاس جانے کے بجائے ونٹورا سے ملاقات کرکے واپس آگی (موج کوثر)

اگر یہاں کہا جائے کہ بات اعتماد کی ہے تو کچھ غلط ہوگا یعنی پیش کش راجہ رنجیت سنگھ کی تھی اور میل بھی راجہ کیطرف سے ہوئی مگر سید صاحب کے سفیر پہلے جنرل ونٹورا سے ملتے ہیں تاکہ ضروری مشورہ فرماسکیں اور حد یہ کہ راجہ رنجیت سنگھ سے گفتگو کئے بغیر واپس ہوجاتے ہیں جو سراسر خلاف اُصول ہے بہرصورت ونٹورا کی چال کامیاب رہی "لیعنی لڑاؤ" اور مجاہدین اس چال کا شکار ہوگئے۔

حیرت یہ ہے کہ مولانا مدنی اور انکے ہم خیال کانگریسی ذہن رکھنے والے حضرات انگریزوں سے جہاد ثابت کرنے کے درپے ہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجاہدین اور انکے قائدین کا واضح عقیدہ اور نظریہ یہ تھا کہ انگریزوں سے جہاد ناجائز و ناروا ہے پھر ہم کیسے تسلیم کرلیں کہ ان حضرات نے انگریزوں سے جہاد کیا ہوگا۔

ہم بالیقین کہہ سکتے ہیں کہ برصغیر میں سید صاحب کی تحریک جہاد کی بالکل وہی صورت تھی جو وہابیان نجد کیوجہ سے حجاز مقدس میں رونما ہوئی۔ وہاں بھی وہابیوں نے انگریزوں کی مدد اور تعاون سے اہل حجاز کا خون بہایا اور فتوؤں کی آڑ میں انکی عصمتوں کو حلال کیا۔ انکی بہو بیٹیاں کو باندیاں بنایا اور ان کے اموال لوٹے اور انھیں گھربار چھوڑنے پر مجبور کیا۔

اور یہاں بھی انگریزوں ہی کی مدد اور تعاون سے سنی حنفی مسلمانوں کو کافر، مشرک، مرتد، منافق اور مبتدع باغی قرار دے کر انکی بہو بیٹیوں کو باندیاں بنایا گیا، قتل و غارتگری کی گئی، لہو سے پتھروں کے سینے سیراب کردئے گئے اور نکاح بیوگان کی آڑ میں پٹھانوں کے ناموس کی دھجیاں بکھیر دی گئیں۔

انگریز یا سکھ

یہ عنوان جناب ایوب قادری صاحب کا قائم کردہ ہے۔ موصوف دورِ جدید کے خاصے نامور مورخ شمار ہوتے ہیں۔ خصوصاً سید صاحب کی تحریک جہاد۔ اور برصغیر سے متعلق احوال وواقعات اور شخصیات پر کافی کچھ لکھا ہے انکے حوالے سے ہمارے نقطۂ نظر کی بھرپور تائید ہوتی ہے کہ "تحریک مجاہدین کا مقصد "وہابی اسٹیٹ" کا قیام تھا جناب قادری لکھتے ہیں۔

> تحریک مجاہدین کے سلسلے میں ایک امر کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے بعض لوگوں نے یہ بحث چھیڑی ہے کہ تحریک مجاہدین کا مقصد سکھوں کا استیصال تھا یا انگریزوں کے اقتدار سے چھٹکارا حاصل کرنا
>
> حقیقت یہ ہے کہ تحریک مجاہدین کا مقصد حکومت الٰہیہ کا قیام اور مسلمانوں کے گئے ہوئے اقتدار کو واپس لانا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کا مقصد مسلمانوں سے زیادہ تو انگریز مورخ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے سمجھا ہے اور انڈین مسلمانس میں واضح کردیا ہے۔
>
> (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء صفحہ ۶۸ ایوب قادری)

اور ہنٹر نے نہایت وضاحت کیساتھ لکھا ہے کہ یہ ایک وہابی تحریک تھی اور نجدی تحریک وہابیت کا چربہ تھی۔ یہ لوگ سرحد میں وہی کچھ کرنا چاہتے تھے جو عرب میں نجدی وہابیوں نے کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ایوب قادری کے علاوہ تقریباً سبھی اہل قلم وہابیوں نے ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی سخت مخالفت کی ہے سرسید سے لیکر مہر صاحب تک جتنے بھی اس قبیل کے مورخین گذرے ہیں کسی نے بھی ہنٹر کی تائید نہیں کی جبکہ ایوب قادری خود لکھتے ہیں۔

> واقعہ یہ ہے کہ یہ شوشہ بھی اپنوں ہی کیطرف سے حکومت برطانیہ کی وفاداری کے سلسلے میں چھوڑا گیا۔ سب سے پہلے سرسید احمد خاں نے (آور انڈین مسلمانس) پر تبصرہ کیا اور ثابت کرنیکی کوشش کی کہ یہ جہاد سکھوں کے خلاف تھا
>
> (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء صفحہ ۶۹)

ایوب قادری صاحب کے مندرجات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ

- سید صاحب کا مقصد جہاد وہابی حکومت کا قیام تھا جسے قادری صاحب حکومت الٰہیہ کہتے ہیں
- اور یہ کہ فی الواقع سید صاحب کی جنگ کسی سے نہیں تھی۔
- اور یہ کہ اس باب میں جو کچھ ہنٹر نے لکھا ہے درست لکھا ہے
- اور یہ کہ سید صاحب کا مقصد سکھوں سے جہاد کرنا نہیں تھا بلکہ انگریزوں سے تھا۔
- اور یہ کہ یہ سر سید صاحب کی اپنی من گھڑت ہے؟

جناب ایوب قادری نے تو یہاں تک لکھدیا ہے کہ

> اس تحریک کے خاص رکن مولوی محمد جعفر تھانیسری نے اصل مواد میں ترمیم کر کے انگریزوں کے بجائے سکھوں کا لفظ لکھا اور مشتہر کیا
>
> (جنگ آزادی صـ ۶۹)

خدارا ہمیں بتایا جائے کہ محمد جعفر تھانیسری، مرزا حیرت دہلوی، سر سید احمد خاں اور انھیں جیسے بہت سے لوگ کون تھے اور کن لوگوں کے بزرگ تھے؟ اور یہ ترمیم، تحریف، تنسیخ کن لوگوں سے سرزد ہوئی۔ اور ایسا کیوں ہوا۔ تاریخ کیساتھ ایسا اندوہناک ظالمانہ مذاق کن لوگوں نے کیا؟ ہر قاری ان باتوں کا جواب طلب کرتا ہے۔

اور یہ کہ کیا قادری صاحب اپنے اس موقف کے ثبوت میں کہ "سکھوں سے جنگ کا شوشہ اپنوں ہی کیطرف سے حکومت برطانیہ کی وفاداری کے سلسلے میں چھوڑا گیا اور یہ کہ انگریزوں کے بجائے سکھوں کا لفظ لکھا اور مشتہر کیا گیا" کوئی ایسا صحیح نسخہ پیش کر سکتے ہیں جس میں سکھ کے بجائے انگریز لکھا ہوا ہو۔

پھر حیرت یہ ہے کہ مولانا مدنی اپنی خود نوشت نقش حیات میں جعفر تھانیسری کو معتمد قرار دیتے ہیں۔

"مولوی محمد جعفر تھانیسری جو سید صاحب کے نہایت مستند سوانح نگار ہیں نقش حیات صـ ۴۱۸"

اور اسی طرح محمد اقبال سلیم گاہندری حیات سید احمد شہید کے ابتدائیہ میں لکھتے ہیں۔

> یہ کتاب حیات سید احمد شہید مصنفہ مولانا محمد جعفر تھانیسری جو اس وقت نفیس اکیڈمی کیطرف سے شائع کیجا رہی ہے حضرت سید احمد شہید کے مخلص متبع کی تصنیف ہے
>
> حیات سید احمد شہید صـ ۴

بہر صورت مجاہدین کا ارادہ سکھوں سے جنگ کا ہو یا انگریزوں سے لڑائی کا خون سرحد کے سنی حنفی پٹھانوں ہی کا بہا گیا اور یہ سب اس منصوبہ بندی کے تحت ہوا کہ پہلے ان (منافقین ،مرتدین) پٹھانوں کو ختم کرو پھر انگریزوں اور سکھوں سے نبٹتے رہینگے۔

اعتراض کا جواب تلوار ہے

چنانچہ جناب ابوالحسن علی ندوی اپنی کتاب "سیرت سید احمد شہید" میں مولوی محمد اسمٰعیل صاحب دہلوی کا ایک خط نقل کرتے ہیں جسکے پڑھنے کے بعد ان کے خونی عزائم کھل کر سامنے آجاتے ہیں ، ملاحظہ فرمائیں

> پھر جب آپکی امامت ثابت ہوگی اور کوئی امر جو اس منصب سے آپکی علحدگی کا سبب ہو نہ پایا گیا پس آپکی اطاعت تمام مسلمانوں پر واجب ہوئی جو آپکی امامت سرے سے تسلیم نہ کرے یا تسلیم کرنے سے انکار کرے وہ باغی مستحل الدم ہے اور اسکا قتل کفار کے قتل کیطرح عین جہاد اور اسکی بےعزتی تمام اہل فساد کیطرح خدا کی عین مرضی ہے۔ اسلئے کہ ایسے لوگ بحکم احادیث متواترہ کلاب النار اور ملعونین اشرار ہیں اس مسئلہ میں اس ضعیف کا یہی مذہب ہے اور معترضین کے اعتراض کا جواب تلوار ہے نہ کہ تحریر و تقریر
>
> (سیرت سید احمد شہید ص۴۲ علی ندوی)

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام کہ ایک شخص ایک گروہ ایک جماعت کو لیکر پہاڑوں میں بنام جہاد جا ٹھہرے اور کچھ لوگوں کو جمع کر کے امامت کا دعوی کر دے تو کیا وہ فوجی لیڈر امام المسلمین کہلا سکتا ہے ۔اور یہ کہ اسکی اطاعت نہ کرنیوالے اسلام کے باغی قرار دئے جائینگے اور اسکے نہ ماننے والوں کا خون حلال ہوگا ، انکے مال و منال لوٹ لئے جائینگے ۔انکی عورتیں باندیاں بنالی جائینگی ؟ بینوا توجروا

شیخ اکرام کی گواہی

اور پھر واقعۃً مولوی محمد اسمٰعیل اور انکے ساتھیوں کی تلواریں بے نیام ہوگئیں اور مسلمانوں کا خون کچھ اسطرح بہایا گیا کہ دریائے اباسین کا پانی سرخ ہوگیا ۔ اگر غور کیا جائے تو مولوی محمد اسمٰعیل کی زبان وہی ہے جو عرب کے نجدیوں کی تھی اور ان کا طرز عمل وہی ہے جو وہابیان نجد کا تھا۔

کیا انھوں نے سرحد میں وہی کچھ نہیں کیا جو نجدیوں کے ہاتھوں حجاز مقدس میں ہو چکا تھا۔ شیخ اکرام لکھتے ہیں ۔

اسکے علاوہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سید صاحب کے بعض ساتھیوں کا رویہ ہمدردی اور معاملہ فہمی کا تھا بلکہ وہ جلد ہی فاتحانہ تشدد پر اتر آئے مثلاً خان اللہ بخش ہی سید صاحب کے مقرر کردہ ایک قاضی کی نسبت لکھتے ہیں۔

ایک موقع پر جب مذکورہ جماعت (مجاہدین) کے قائد سید محمد جہاں کے ارشاد پر کہ جو اہل رسوم خدا و رسول کے حکم کے خلاف باپ دادا کی ریت پر چلتے ہیں وہ عملاً کافر ہیں۔ کسی نے کہدیا کہ منیۃ المصلی میں اہل رسوم کو کافر نہیں کہا گیا تو اس کا جواب گھونسوں سے دیا گیا۔ اور قائد موصوف نے اسوقت تک معترض کو نہیں چھوڑا جب تک اس نے دوبارہ کلمہ نہیں پڑھ لیا۔ بالفاظ واضح تر اُسے دوبارہ مسلمان بنایا گیا۔

موج کوثر صفحہ ۳۱ شیخ محمد اکرام

ابوالحسن علی ندوی فرماتے ہیں

جناب علی ندوی مجاہدین کے قتل کے اسباب و محرکات کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

مذکورہ بالا اسباب میں اتنا اور اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ سمہ کے علاقہ میں جو غازی متعین یا مقیم تھے۔ یا کبھی کبھی کسی ضرورت سے دورہ کرتے تھے اُن میں سے جنکو زیادہ صحبت و تربیت میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا یا مزاجاً درشت اور لا ابالی واقع ہوئے تھے اُن سے کہیں کہیں بدعنوانیوں اور تعدی کے واقعات بھی پیش آئے

سیرت سید احمد شہید ج ۲ ص ۲۲۲

اگرچہ ان وحشت خیز واقعات کے ذکر میں جناب علی ندوی کا لہجہ دھیما اور دبا دبا سا ہے مگر بات وہی ہے جو شیخ اکرام کی تحریر سے مظہر ہے۔ اور یہ تمام کاروائیاں اُن فتاوٰں کے زیر اثر عمل میں لائی جاتی تھیں جو امیر المومنین کیطرف جاری کئے جاتے تھے اور یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ اس قسم کے فتاوٰے مولوی محمد اسمٰعیل ہی تصنیف فرماتے تھے۔ ملاحظہ [illegible]ائیں۔

سید صاحب کی امامت از روئے قوانین شرعیہ تعامل ثابت و برحق ہے آپکی اطاعت فرض اور اس سے خارج باتفاق کتاب و سنت و اجماع و نصوص فقہ باغی سکا قتل واجب۔ اسکا خون حلال اور وہ ناری ہے اسپر نماز جنازہ بھی نہیں پڑھنی چاہئے

(سیرت سید احمد شہید جلد ۱ ص ۹۶)

اسے کہتے ہیں "ذئابٌ فی ثیاب" دوسروں پر شر انگیزی۔ فتنہ سازش۔ فتویٰ بازی کا الزام لگانیوالوں کو چاہیے کہ اس آئینہ کو سامنے رکھیں تاکہ انھیں اپنی تصویر نظر آتی ہے۔ اور مظلومیت کا لبادہ اوڑھ کر دوسروں کو ظالم قرار دینے والوں کو اب سوچنا چاہیے کہ تادیر یہ تقدس مآبی باقی نہیں رہ سکتی۔

حیرت انگیز انکشاف مرزا حیرت دہلوی نے اپنی کتاب "حیات طیبہ" میں جہاں علمائے کرام اور مشائخ عظام پر نہایت گھناونے اور رکیک حملے کیے ہیں وہیں جھونک میں کچھ ایسی باتیں بھی لکھ گئے ہیں جن سے ہمارے موقف کی تائید ہوتی ہے جناب حیرت لکھتے ہیں۔

> فتح پشاور کے بعد احکام شرع ناگوار صورت میں پبلک کے سامنے پیش کیے جاتے تھے صدہا غازیوں کو مختلف عہدوں پر مقرر فرمایا تھا کہ وہ شرع محمدی کے موافق عمل درآمد کریں۔ مگر انکی بے اعتدالیاں حد سے بڑھ گئی تھیں وہ بعض اوقات نوجوان خواتین کو مجبور کرتے تھے کہ اُن سے نکاح کرلیں اور بعض اوقات یہ دیکھا گیا کہ عام طور پر دو تین دوشیزہ لڑکیاں جاری ہیں مجاہدین میں سے کسی نے انھیں پکڑا اور زبردستی مسجد میں لیجا کر نکاح پڑھوا لیا
>
> حیات طیبہ جز اول ص ۲۱۲

الحاصل ہم "ہاتھی کے دانت" نامی کتاب میں جناب سید احمد بریلوی اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے جہاد اور اسکے اسباب و بواعث، پٹھانوں کی فداکاری اور اُن پر فتاوٰں کی بمباری، مجاہدین کی بے اعتدالیاں۔ اور اس تحریک جہاد کے ناکامی کے اسباب، وہابی عقائد و نظریات اور پھر اس باب میں مورخین کا اضطراب ناقابل تردید حقائق کی روشنی میں بیان کر چکے ہیں۔

تقویۃ الایمان

عقائد و نظریات کی اہمیت اس سے پہلے کہ ہم تقویۃ الایمان (مصنفہ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی) اور جناب ایوب قادری کے دور اول اور تحریک جہاد کے متعلق مزید خیالات کا اظہار کریں ان اختلافات کے بنیادی وجوہ کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں

دورِ حاضر کی تصنیفات و تالیفات کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ اس دور کے اہل قلم حضرات عقائد و نظریات کے اختلافات کو عمداً کوئی وقعت نہیں دیتے۔ حالانکہ قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ میں عقائد و نظریات کو بہت بڑا دخل ہے۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ عقائد و نظریات کی بنیاد پر ملک کے ملک زیر و زبر ہو گئے۔ بہتے ہوئے لہو کی حرارت سے زمین کا شاداب سینہ جھلس کر رہ گیا ہے۔ ایک ہی ملک ایک ہی قبیلہ ایک ہی خاندان کے لوگوں نے صرف نظریاتی اختلاف کی بنیاد پر ایک دوسرے کی گردنیں کاٹ ڈالی ہیں۔

آپ اس دور کی تصنیفات ہی کو دیکھ لیجئے کہ تذکرہ نویس حضرات پر کس قدر انانیت اور نظریاتی تعصب کا غلبہ ہے کہ صرف نظریاتی اختلاف کی بنا پر کیسے کیسے عظیم لوگوں کو تاریکیوں کے حوالے کر دیا گیا ہے۔

میں یہ کہنے میں قطعاً باک نہیں محسوس کرتا کہ عقائد و نظریات ہی کے اختلاف کی وجہ سے سید احمد بریلوی اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے پٹھانوں کو مشرک، منافق، باغی قرار دے کر ہر قسم کا جور و ستم روا رکھا اور عقائد و نظریات ہی کے اختلاف کی وجہ سے پٹھانوں نے جناب سید احمد بریلوی اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کو تہ تیغ کر دیا۔

اختلاف کا پہلا بیج

یہ بات علی روس الاشہاد کہی جا سکتی ہے کہ مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی "تقویۃ الایمان" کے وجود میں آنے سے پہلے برصغیر کے علماء میں کوئی قابل ذکر اختلاف نہیں تھا۔ اور اگر تھا تو کم از کم تاریخ اس کو کوئی وقعت نہیں دیتی۔۔ مگر پھر اچانک ہی اتفاق و اتحاد کی پوری فضا دھندلا کر رہ گی۔ اور مولوی محمد اسمٰعیل کی تقویۃ الایمان کو افتراق بین المسلمین کا شرف حاصل ہو گیا۔

اور میں علی رؤس الاشہاد کہہ سکتا ہوں کہ یہی انگریزوں کا مقصد تھا جو "تقویۃ الایمان" کے ذریعہ پورا ہو گیا۔ جناب "روشن مستقبل کے مصنف" طفیل احمد منگلوری فرماتے ہیں۔

> ہندو مسلمان کے مابین عام مخالفت برطانیہ کے عہد میں شروع ہوئی۔ اسکے بعد جو طریقہ اختیار کیا گیا اُسکا حال "سرجان میلکم" کے قول سے معلوم ہو گا۔ وہ یہ ہے اس قدر وسیع سلطنت میں ہماری غیر معمولی قسم کی حکومت کی حفاظت اس امر پر منحصر ہے کہ ہماری عملداری میں جو بڑی جماعتیں انکی عام تقسیم ہو۔ اور پھر ہر ایک جماعت

> کے ٹکڑے مختلف ذاتوں اور فرقوں اور قوموں میں ہوں ۔ جب تک یہ لوگ اس طریقے سے جدا رہینگے ۔ اُس وقت تک غالباً کوئی بغاوت اٹھ کر ہماری قوم کے استحکام کو متزلزل نہ کریگی ۔
>
> (مسلمانوں کا روشن مستقبل ص۲۴)

جناب منگلوری کے اس ارشاد کے پیش نظر ہمارا یہ عقیدہ صحیح ہے کہ "ہندوستان میں" کم از کم مسلمانوں کے درمیان افتراق کی یہ فضا نہیں تھی ۔ اور یہ فضا انگریزوں نے اپنی مقصد برآری کیلئے پیدا کی ۔ تو اب ہمیں انصاف کی نظر سے یہ دیکھنا پڑے گا کہ اختلاف و انتشار کا مخرج کہاں ہے ۔ اور وہ مخرج "تقویۃ الایمان" ہے جسکے ذریعہ تمام مسلمانوں کو کافر بنا کر فتنے کا بیج بو یا گیا ۔

چنانچہ جناب ایوب قادری جو مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اور انکے مخدوم سید احمد بریلوی کے نہایت پُرجوش حمایتی اور مداح ہیں اپنی کتاب جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں لکھتے ہیں ۔

> تحریک مجاہدین پر ایک نظر ! دور اول سید احمد کی تحریک تجدید و احیائے دین اور جہاد کی تحریک تھی توحید خالص کی تبلیغ شرک و بدعت اور قبر پرستی کا استیصال مراسم محرم کی بیخ کنی شادی و غمی نیز دیگر تقریبات کے غیر اسلامی مراسم کے بجائے اسلامی سادہ زندگی کا احیاء ۔ اور نکاح بیوگان کی ترویج و اشاعت اسی تحریک کے خاص عنصر تھے ۔ اس مقصد کیلئے شاہ اسمٰعیل شہید نے تقویۃ الایمان جیسی انقلاب آفریں کتاب لکھی ۔
>
> جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ص۵۴

مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی تقویۃ الایمان کے بارے میں ایک اور انقلاب آفریں خیال ملاحظہ فرمائیے ۔ مولوی محمد عارف سنبھلی جو ندوۃ العلماء کے استاد ہیں لکھتے ہیں ۔

(اسی مجاہدانہ جذبہ سے سرشار ہو کر انھوں نے تقویۃ الایمان لکھی اور شیطان اور اسکے چیلوں چانٹوں نے امت محمدیہ کے جاہل طبقوں میں جو شرک پھیلا دیا تھا اس پر بھبک فاروقی انداز میں بھرپور وار کیا اور حق یہ ہے کہ اسکو جہنم رسید کر دیا ۔

(بریلوی فتنہ کا نیا روپ ص۱۴)

اور اب جناب ایوب قادری ہی کے قلم سے اس کتاب کا حاشیہ بھی ملاحظہ فرمالیں تا کہ بات واضح ہو جائے۔ لکھتے ہیں۔

> مولانا فضل حق نے سب سے پہلے "تقویۃ الایمان" اس شہنشاہ کی تو یہ شان.... کی برابر کے پیدا کر ڈالے پر امتناع نظیر اور امکان نظیر کی بحث چھیڑی ایک مختصر سا رسالہ اس عبارت کی رد میں لکھا پھر تو اس سلسلے میں بہت سے رسالے قلمبند ہوئے اور تقویۃ الایمان کے مستقل رد لکھے گئے۔
>
> غرض اس تحریک کی مخالفت کے آغاز کا سہرا مولانا فضل حق خیر آبادی کے سر ہے
>
> (حاشیہ ۱ صہ ۵۴ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء)

جناب قادری اس بات پر تو برہم ہیں کہ مولانا فضل حق نے "تقویۃ الایمان" کا رد لکھا مگر تقویۃ الایمان جیسی گمراہ کن کتاب کو اس کی تمام حشر سامانیوں سمیت ہضم کر گئے۔

خود قادری صاحب کا یہ حال ہے کہ اپنے ممدوح مولوی محمد اسماعیل صاحب دہلوی کی اس انقلاب آفریں کتاب کا لبعینہ حوالہ بھی درج فرمانیکی جراُت نہ کر سکے۔

تقویۃ الایمان واقعی انقلاب آفریں کتاب ہے جس نے برصغیر کی ہنستی مسکراتی محبت و مروت سے لبریز سرزمین پر نفرت و عداوت کے شعلے بھڑکا دیئے اس انقلاب آفریں کتاب کی بابت تو ہم پھر کبھی کسی موقعہ پر گفتگو کرینگے۔ پہلے آپ مکمل حوالہ ملاحظہ فرمائیں جسے قادری صاحب نے نہ جانے کن مصلحتوں کی بنا پر نظر انداز کر دیا ہے۔

> جو کوئی کسی نبی ولی کو، امام شہید کو یا کسی فرشتہ کو یا کسی پیر کو اللہ کی جناب میں اس قسم کا شفیع سمجھے تو وہ اصلی مشرک ہے اور بڑا جاہل کہ اس نے خدا کے معنی کچھ بھی نہ سمجھے اور اس مالک کی قدر کچھ بھی نہ پہچانی۔ اس شہنشاہ کی شان تو یہ ہے کہ ایک آن میں ایک حکم کن سے چاہے تو کروڑوں نبی، جن فرشتے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر پیدا کر ڈالے۔
>
> (تقویۃ الایمان راشد کمپنی دیوبند صہ ۲۲)

پوری تقویۃ الایمان گستاخیوں ابیباکیوں کا کھولتا ہوا سمندر ہے جس نے نہ جانے کتنے

آباد دلوں کو ویران کر دیا ہے حق یہ ہے کہ جیسے قادری صاحب انقلاب آفریں کتاب فرماتے ہیں وہ اس قابل ہے کہ نذرِ آتش کر دیا جائے۔ یاد رہے کہ مولوی محمد اسماعیل کی اس کتاب پر گرفت ہی نے مولانا فضل حق خیر آبادی علیہ الرحمہ کو ان کا معتوب کیا ہے اگر حضرت خیر آبادی گرفت نہ فرماتے تو سب کچھ ٹھیک تھا۔

اسکے باوجود اس باب میں جناب ایوب قادری ستائش کے لائق ہیں کہ انہوں نے اختلاف کے بنیادی نقطۂ نظر کا ذکر کیا اور اس کا بھی اقرار ہے کہ تقویۃ الایمان کے بعد ہی نظریاتی معرکہ آرائی شروع ہوئی۔ اور یہ کہ تقویۃ الایمان ہی اختلاف کی وجہ بنی ہے۔

اور یہ اختلافات اسوقت بہت واضح ہو گئے تھے جب سید احمد بریلوی اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے سرحد میں یکگونہ برتری حاصل کر لی تھی۔ اور یہی اختلاف پہاڑوں میں ان کی مکمل تباہی کے اسباب بنے۔

بنیادی نقطۂ نظر کا اختلاف

اس سلسلے میں جناب شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں۔

> سید صاحب اپنے رفقاء کی بے اعتدالیوں کو روکنے کی مسلسل کوشش کرتے رہے اور جانتے تھے کہ سمجھدار اور معاملہ فہم حضرات کو ذمہ داریاں سونپنی چاہیں۔ مثلاً انہوں نے بڑی کوشش کی کہ مولانا خیر الدین قاضی القضاۃ بننے پر آمادہ ہو جائیں عشر کا بھی شاید کوئی حل نکل آتا۔ لیکن مجاہدین اور باقی باشندوں میں تو بنیادی نقطۂ نظر کا اختلاف تھا۔ قبائل کو جو رسمیں عزیز تھیں مجاہدین کے نزدیک وہ کفر تھیں جالات کو دیکھ کر وہ یہی فیصلہ کر سکے کہ مروجہ رسومات خلاف شریعت اسلامیہ تھیں اسوجہ سے پہلے انکی اصلاح ہونی چاہئے اور اسکے لئے اقدام شروع کر دیا۔ اور قرن اول کے مخلص مسلمانوں کیطرح بیک جنبش لب احکام خداوندی کو نافذ کرنا چاہا اور اس کا مطلق خیال نہ کیا کہ وہ قوم قرن اول کی قوم نہ تھی
>
> موج کوثر ص ۲۱ شیخ محمد اکرام

اس سلسلے میں اگرچہ جناب شیخ اکرام چبا چبا کر بات کرنے کے عادی ہیں اور مدح سرائی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے پھر بھی حقیقت کا اظہار بہر صورت ہو گیا ہے۔ مثلاً یہی کہ

"مجاہدین اور باقی باشندوں میں تو بنیادی نقطۂ نظر کا اختلاف تھا" اگر ٹھنڈے دل سے تجزیہ کیا جائے تو معاملات کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی یہ بات بہایت آسانی سے ثابت ہو سکتی ہے کہ اتنا خون خرابہ تو غلط رسموں کی بنیاد پر ہوا نہ ہی عشر کیوجہ سے ہوا اصل سبب بنیادی نقطۂ نظر کا اختلاف تھا۔ حیرت ہے کہ سید صاحب کے قدیم وجدید مورخین بار بار یہی کہتے اور لکھتے ہیں کہ رسموں کی بنا پر جنگ ہوئی اور تباہی پھیلی، مگر یہ لوگ کیوں نہیں سوچتے کہ رسموں کیوجہ سے آدمی مشرک بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ پھر یہ کہ جن چیزوں کو یہ حضرات صریح شرک فرما رہے ہیں وہ شرک بھی ہے یا نہیں! وہاں تو برجستہ مشورے دیئے جا رہے تھے۔

> مولانا نے (مولوی محبوب علی صاحب) راستے سے سید صاحب کو ایک خط لکھا جس میں اس بات پر ناگواری کا اظہار اور اعتراض تھا کہ آپ نے درانیوں سے صلح کیوں کر لی ہے جو مجاہدین ومہاجرین کے سد راہ بن رہے ہیں اور اسکو توکل وعزیمت کے منافی بتایا اور صاف صاف مشورہ دیا کہ پہلے ان کلمہ گو کافروں سے جہاد کرنا چاہیے
>
> سیرت سید احمد شہید جلد ۲ ص ۵۳

ذوق خون ریزی

غور فرمائیے یہاں اسلامی اخلاق فاضلہ کا کہیں دور دور پتہ نہیں چلتا جو ہندوؤں اور سکھوں کیلئے ردا تھا مگر مسلمان پٹھانوں کو کافر اور مشرک بنا کر شوق جہاد پورا کیا جا رہا ہے۔ اور یہی نہیں کہ یہ صرف مشورہ تھا۔ اس کا جواب بھی دیکھتے چلیں۔

> انشاء اللہ تعالیٰ اس عاجز کا قصد ہے کہ بیس روز یا تقریباً ایک ماہ کے بعد پشاور جائے۔ میں نے ہرگز ہرگز منافقوں کیساتھ کوئی مصالحت نہیں کی ہے اور نہ کبھی ان سے موافقت کی کوئی راہ نکالی ہے
>
> (مکتوبات سید احمد شہید ص ۲۰۱)

بس

پیو ریکے جواب

جواب فتویٰ

بنیادی نقطۂ نظر کے باب میں فتویٰ بازی ہوتی رہی اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اور انکے مقلدین، معاندین شرک وکفر کی توپ بازی کرتے رہے نتیجہ یہ نکلا کہ پہاڑوں میں بسنے والے سادے لوگ جو سید صاحب اور انکے غازیوں کے اتنے معتقد تھے کہ انکی سواریوں کی خاک آنکھوں سے لگاتے تھے یکدم بھرہم ہو گئے۔

جیسا کہ شیخ اکرام ہی آگے چل کر لکھتے ہیں۔

> اور شاید بعض مخلص قدیم الخیال ہستیوں کو بھی سید صاحب کے بعض ساتھیوں کے طور طریقے بلکہ عقائد بھی کھٹکتے ہوں۔
> نتیجہ یہ ہوا کہ سرداران پشاور اور علماء کا مجاہدین کے خلاف متحدہ محاذ قائم ہوگیا مجاہدین کے خارج از اسلام اور واجب القتل ہونے کے فتوے دئے گئے
>
> موج کوثر صفحہ ۳۱

تنگ آئے ہوئے علمائے سرحد برجستہ کہا کرتے تھے کہ

> یہ لوگ مسلمانوں کے جان و مال کو کوئی چیز نہیں سمجھتے اور بلاوجہ شرعی مسلمانوں کی جان و مال پر دست درازی کرتے ہیں۔ بعض لوگ اس سے آگے بڑھ کر مجاہدین کو باغی مقتولین کو شہید کہتے تھے۔
>
> سیرت سید احمد شہید ج ۲ صفحہ ۲۲۴

مناظرہ بازی

اور پھر یہ اختلاف اتنے بڑھ گئے کہ پہاڑوں میں عین جہاد کے موقع پر بھی مناظرہ بازی کا شوق اور شرک و کفر کی الزام تراشی کا شغل جاری رہا۔ چنانچہ جناب شیخ اکرام لکھتے ہیں۔

> لیکن جہاد کے دوران میں جب مخالفین عام مسلمانوں کو سید صاحب کے عقائد کے بارے میں بہکانے لگے انہوں نے بمقام پنجتار مذہبی مسائل کی تشریح کیلئے افغان علماء کو بلایا اور شاہ اسمٰعیل صاحب نے بڑی قابلیت سے مسئلہ عدم وجوب تقلید کی حمایت کی
>
> موج کوثر صفحہ ۲۲

اب تک تو ہم یہ سنتے آرہے تھے کہ یہ شرف صرف بغداد والوں کو حاصل تھا کہ دشمن سرحدوں پر آگ لگا رہا تھا اور اہل بغداد مناظرہ کر رہے تھے۔
مگر یہاں بھی تقریباً وہی صورت حال بن گئے تھے جہاد کرنے اور پٹھانوں سے مناظرہ بازی کر رہے تھے یا پھر شرک کا فتویٰ لگا کر جہاد کی مشق فرمایا کرتے تھے۔
غالباً انھیں حالات کے پیش نظر مولوی محبوب علی نے اجنکا ذکر ہم کر آئے ہیں جو مجاہدین

کا ایک قافلہ لیکر پہاڑوں میں پہنچے تھے) بڑی عجیب بات کہی تھی کہ

> تمہارے اوپر بیوی بچوں اور والدین کے حقوق ہیں تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ لوگوں نے کہا جہاد کیواسطے! مولوی صاحب نے کہا جہاد کہاں ہے! اور کون کفار سے مقابلہ ہے کس ملک میں تمہارا عمل دخل ہوا۔ ! صبح سے شام تک تم لوگ کھانے پکانے کی فکر میں رہتے ہو جہاد کا محض بہانہ ہے تمہاری دنیا اور آخرت دونوں خراب ہیں
>
> سیرت سید احمد شہید جلد ۲ ص۲۵

محبوب حق کا منبعٔ ومنصب

اور پھر مولوی محبوب علی لڑ جھگڑ کر بہتر سے مجاہدین کیساتھ واپس ہو گئے۔ پھر عرصہ تک ہندوستان سے رقوم اور قافلے دونوں بند رہے۔ اور ہزار جتن کے بعد پھر یہ سلسلہ جاری ہوا۔ غور فرمایئے کہ کیا یہی حال تبلیغی جماعت کا نہیں ہے؟ اور کمال یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو مجاہدین بھی کہتے ہیں اور انکا دھندا بھی وہی ہے جو مولوی محبوب صاحب نے کہا ہے "صبح سے شام تک تم لوگ کھانے پکانے کی فکر میں رہتے ہو جہاد کا محض بہانہ ہے تمہاری دنیا و آخرت دونوں خراب ہیں"

یکطرفہ کاروائی

جناب شیخ محمد اکرام یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اب تک پٹھانوں کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا رہا ہے وہ ایک یکطرفہ کاروائی تھی یا تو پٹھانوں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی یا انکے موقف کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا۔ اور پروپیگنڈے کے زور پر پٹھانوں کو ظالم اور مجاہدین کو مظلوم قرار دے کر داستان گوئی شروع کر دی گئی ——— لکھتے ہیں

> اس افسوسناک انقلاب احوال کا تجزیہ کرنا اور اسکے اسباب وبواعث ڈھونڈنا تاریخ نگار کا تلخ فرض ہے۔ لیکن آج یہ کام کسی قدر آسان ہو گیا ہے ——— اب تک اس سانحہ کے متعلق فقط سید صاحب کے عقیدت مندوں کے بیانات ملتے تھے جنکی ترجمانی عہد حاضر میں مولانا مہر نے بڑے جوش وجذبے سے کی ہے
>
> موج کوثر ص۳۰

اگر غیر متعصبانہ طریقہ سے دیکھا جائے، تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ پٹھانوں

نے کوئی نئی اورانوکھی حرکت نہیں کی تھی "مرتا کیا نہ کرتا" کے مصداق فتووں کا جواب فتووں سے دیا تھا۔ اور تلوار کا جواب تلوار سے

پھر اس باب میں صرف پٹھانوں ہی کو کیوں قابل ملامت اور لائق گردن زدنی قرار دیا جاتا ہے۔ سید صاحب کے مجاہدین اور غازیوں نے بھی تو فتوئی ہی کی آڑ میں ہر قسم کی تعدی سرکشی بلکہ بدکرداریاں روا رکھی تھیں اور انتہائی دیدہ دلیری سے چلتی پھرتی لڑکیوں کو بنام جہاد اٹھا کر مسجد میں داخل ہو جایا کرتے تھے اور نکاح کئے بغیر نہ چھوڑتے (گویا ان حضرات نے خانہ خدا کو شیروں کا بنا رکھا تھا) غیر جانبدار شخص ان حالات کے پیش نظر اسے شرعی غنڈہ گردی کے علاوہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔

کردار کی بلندی

> مگر حیف در حیف انکے ہمراہیوں نے تو لذائذ نفسانیہ اور اپنی خرد ماغی سے لٹیا ہی ڈبو دی اور ایسا ستیاناس کر دیا کہ اس کو ملک پنجاب کو چھوڑتے بن پڑا
>
> حیات طیبہ صـ ۲۴۳

بہر صورت اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو کچھ ہوا اسکی بنیاد نظریاتی اختلاف تھا اور اس کا پہلا بیج "تقویۃ الایمان ہے" اور اسکی بنیاد مولوی اسماعیل دہلوی نے رکھی جو عین جنگ کے وقت جب انکے مجاہدین کی پٹھانوں سے لڑائی ہو رہی تھی ان الفاظ میں ہدایات جاری فرماتے تھے۔

شوق خون آشامی

> مولانا محمد اسماعیل صاحب نے حکم دیا کہ توپ کو کھینچ کر مسجد کے شمال مغرب کی ٹیکری پر نصب کر دیا جائے۔ آپ نے بائیں ہاتھ کیطرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اس طرف کفار پر ضرب لگانی چاہیے۔ دوسری جانب دائیں ہاتھ کیطرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اس طرف منافقین پر
>
> (سیرت سید احمد شہید صـ ۳۳۶)

ع پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں

وہابی یا اہلحدیث

ایک ہی کنبہ کے لوگ

وہابی کہہ لیں، یا اہل حدیث یا پھر محمدی بات ایک ہی ہے۔ یہ حضرات بھی فرنگی دور کی برکات سے برصغیر کیلئے تحفہ ہیں۔ یہاں ہم بطورِ خاص انکی سیاسی خدمات کا تذکرہ کرینگے اور پھر قارئین خود ہی فیصلہ کرلینگے کہ یہ لوگ کون ہیں صحیح یہ ہے کہ دیوبندی اور وہابی ایک کنبہ اور اعتقاداً ایک ہی مکتبۂ فکر کے زائیدہ ہیں۔

دیوبندی حضرات حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے قریب ہونیکے مدعی ہیں۔ اور وہابی خالص اسماعیلی فرقہ ہونیکے مدعی ہیں دوسرے لفظوں میں "علاتی" "اخیافی" بھائی بھی کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔

اور زمانہ جدید کے اہل قلم جو ان حضرات کے مقلد و مداح ہیں ان دونوں کے مرکب کو "مسلک ولی اللہ" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

اور جس مسلک کو یہ حضرات مسلک ولی اللہ کہتے ہیں وہ بھی عجیب چیز ہے جسکا تفصیلی جائزہ پھر کبھی انشاء اللہ تعالیٰ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ سید احمد بریلوی صاحب کی ہمنوائی میں پیش پیش ہیں۔ تو اہل حدیث حضرات مولوی محمد اسماعیل صاحب کی تعریف و توصیف میں اتنا آگے بڑھ جاتے ہیں کہ سید احمد صاحب بریلوی جو مولوی محمد اسماعیل صاحب کے مرشد و مخدوم ہیں انکی حیثیت بے حقیقت ہوکر رہ جاتی ہے، مثلاً مرزا حیرت جب داستانِ حیرت ناک سناتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا سید صاحب پر تبرا فرما رہے ہیں۔

اور شاید اسی وجہ سے "جنگ آزادی ۱۸۵۷ء" کے مصنف جناب ایوب صاحب نے وہابیوں کو تاریخی حیثیت سے انکی سرحدوں میں دھکیل دیا ہے اور تقریباً وہ تمام باتیں لکھ ڈالی ہیں جنکو چھپانے کی کوشش کیجارہی تھی اور جواب آں غزل کے طور پر جناب برق التوحید صاحب نے (وہابی اہل قلم) خاصی برق اندازی فرمائی ہے اور دیوبندی مکتبۂ فکر کا کچا چٹھا کھول کر چوک میں رکھدیا ہے۔

اس سلسلے میں کچھ روشنی جناب طفیل احمد صاحب منگلوری نے بھی اپنی کتاب "مسلمانوں

کاروشن مستقبل" میں ڈالی ہے۔ فرماتے ہیں۔

> سید صاحب بریلوی کا مذہبی مسلک ہمہ گیر تھا یوں کہنے کو تو آپکے مخالف آپکی جماعت کو وہابی کہتے تھے مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ جماعت دو مختلف اور متضاد گروہوں سے مرکب تھی جنھیں متحد رکھنے میں وہ مدت العمر مساعی رہے۔ ان میں سے ایک گروہ کے سردار مولوی عبدالحی اور مولوی کرامت علی جونپوری تھے جو اہلسنت کا طریقہ رکھتے تھے اور دوسرے گروہ کے سردار مولوی اسماعیل تھے جو چاروں اماموں کی تقلید سے آزاد تھے اور براہ راست حدیث کو اپنا ماخذ قرار دیتے تھے خود سید صاحب عمل کے اعتبار سے حنفی تھے مگر اسی کیساتھ مولوی اسماعیل کی جماعت کی سرپرستی کرتے تھے جو اپنے آپ کو محمدی کہتے تھے
>
> (مسلمانوں کاروشن مستقبل ص ۱۲۸)

یعنی سید احمد صاحب بریلوی یہ بھی تھے اور وہ بھی تھے۔ بلفظ دیگر عملاً حنفی تھے اور اعتقاداً وہابی تھے اور انکے اپنے سلسلے کا نام محمدی تھا۔ اسے آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں بوقت ضرورت حنفی تھے اور جب کوئی ضرورت نہ ہو تو محمدی تھے جناب شیخ محمد اکرام صاحب کتاب "موج کوثر" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ۔ انھوں نے اپنے سلسلہ کا نام طریق محمدیہ رکھا تھا ان کا دستور یہ تھا کہ پہلے طریقہ چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ، سہروردیہ میں باواز بلند بیعت لیتے پھر طریقہ محمدیہ میں بیعت لیتے تھے۔ اس باب جناب محمد علی قصوری بھی اپنی کتاب مشاہدات کابل و یاغستان میں کچھ فرماتے ہیں۔ (چنانچہ باوجودیکہ وہ حنفی تھے لیکن بہت سے مسائل حنفی مسلک سے انحراف کر کے سنت کے مطابق یا کسی دوسرے مجتہد کے اجتہاد کے مطابق فتویٰ دیتے تھے اور اس مسلک کو انھوں نے مسلک احمدیت کے نام سے موسوم فرمایا (مشاہدات کابل و یاغستان ص ۱۰)

اب نہ جانے شاہ اسماعیل صاحب کس سلسلہ میں بیعت تھے کیونکہ اُنکے نزدیک ہر سلسلہ بیعت بدعت و ضلالت ہے۔

چنانچہ اپنی مشہور کتاب تذکیرالاخوان بقیہ تقویۃ الایمان میں لکھتے ہیں۔

> "تم اپنے دین میں نئی نئی رسم اور نئے نئے عقیدے اور طریقے نہ نکالو اور جھوٹ

> نہ ڈالو کہ کوئی معتزلی ہوئے کوئی خارجی بنے اور کوئی رافضی اور کوئی ناصبی اور کوئی مرجی کہلاوے ۔ ۔ ۔ ۔ پھر ان میں کوئی قادری کوئی سہروردی کوئی نقشبندی کوئی چشتی بنے الخ
>
> (تذکیر الاخوان بقیہ تقویۃ الایمان ۵۵ طبع دیوبند)

یہ بھی مجاہدین ہیں

وہابیوں کے پرجوش مورخین نے انھیں بھی مجاہدین کی صف اول میں شمار کیا ہے ۔ حالانکہ پوری صدی گذر جانیکے باوجود اب بھی یہ حضرات افرادی لحاظ سے اتنی تعداد میں نہیں ہیں کہ کسی باقاعدہ فوج کی تشکل اختیار کرسکیں ۔

چنانچہ جناب ثناء اللہ امرتسری شمع توحید میں فرماتے ہیں

> امرتسر میں مسلم آبادی غیر مسلم آبادی (ہندو سکھ) کے مساوی ہے ۔ اسی سال پہلے قریباً سب مسلمان اسی خیال کے تھے جنکو آج کل بریلوی حنفی کہا جاتا ہے
>
> (شمع توحید مکتبۃ ثنائیہ ص۱۹۵۶ء مطبوعہ ثناء اللہ امرتسری)

مگر اہل قلم فرماتے ہیں کہ مجاہدین تھے، سکھوں اور انگریزوں سے انھیں خاص دشمنی تھی، انگریز انکے نام سے تھراتے تھے سکھوں پر لرزہ طاری ہوجاتا تھا ۔ تو ہمیں کیا انکار ہوسکتا ہے ۔

ہمیں قلم کی آبرو کا احترام ہے ۔ ہم تسلیم کرلیتے ہیں کہ یہ خشک وغیرہ لوگ اول درجہ کے غازی اور مجاہد تھے ۔ خوارج ہی کیطرح تنخواہ دار جنگ جو تھے ۔ اور یہ کہ انگریزوں کے ازلی دشمن بھی تھے ۔ انکی ڈھکار سے سات سمندر پار کھلبلی مچ جاتی تھی ۔

مگر خدارا ہمیں یہ بتایا جائے کہ ان واقعات و روایات کو کہاں رکھا جائے اور کس خانہ میں فٹ کیا جائے جو ان حضرات نے خود ہی مع تصدیقات کے رقم فرمائی ہیں ۔ اور یہ روایات سراسر انگریز دشمنی کی نفی کرتی ہیں ۔

مورخین کی ہٹ دھرمی

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ کچھ لوگ بہر صورت ثنا خوانی اور مدح سرائی کے قائل ہیں ۔ چاہے حقائق و شواہد اور واقعات و روایات اسکی کتنی ہی کیوں نہ نفی کرتے ہوں ۔ ہر حال میں انکی ضد اور ہٹ دھرمی باقی رہتی ہے ایک نے کہا تھا کہ بیس اور بیس ساٹھ ہوتے ہیں ۔ دوسرے نے کہا غلط کہتے ہو

بیں ڈبیس چالیس ہوتے ہیں لہذا شرط لگ گئی ۔ بیوی نے میاں سے کہا ۔ میاں تم شرط ہار جاؤ گے بیں اور بیس چالیس ہی ہوتے ہیں ۔ اُس نے ہنس کر کہا میں بھی جانتا ہوں ۔ مگر تو بڑی بھولی ہے جب میں مانوں گا تب ہاروں گا ۔ نہ میں مانوں گا نہ ہاروں گا اس باب میں شیر بہادر نیتی کا بھی یہی مسلک ہے ۔ جناب ہی افادات مہریہ میں لکھتے ہیں

> میں مجاہدین کی شان و آبرو بہر حال قائم رکھنے کا قائل ہوں اگرچہ وہ بعض سابقہ بیانات اور توجیہات سے عین مطابق نہ ہو
>
> افادات مہر صـ۲۳۱

اب آپ ہی فرمائیں جہاں یہ صورت حال ہو کوئی کیا کر سکتا ہے ۔ یہ تو تاریخ کا منہ چڑھانے والی بات ہے یعنی حقائق و شواہد چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہوں یہ حضرات مجاہدین کی شان بڑھاتے رہینگے ۔ جناب مسعود عالم صاحب ندوی لکھتے ہیں

> مولانا سندھی کی کتاب ”ولی اللہ اور انکی سیاسی تحریک“ وسیع مطالعہ اور عمیق فکر کا نتیجہ ہے ۔ مگر انھوں نے حزب ولی اللہ کی تشکیل اور من مانی توجیہ کی خاطر سید صاحب کے ماننے والوں پر بڑا ظلم کیا ہے ۔ اور انکی کمزوریوں کی تنقید و مذمت میں اُن کا قلم اعتدال پر قائم نہیں رہ سکا ہے
>
> (ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک صـ۱)

ہم کیا سمجھیں

ان حالات و وجوہات کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم تو یہی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ حضرات نہ تو اس قسم کے مجاہد تھے جنکی دھوم مچی ہوئی ہے ۔ نہ ہی اسطرح کے غازی تھے جنکا شہرہ دور دور تک ہے ۔

حق یہ ہے کہ اگر گہری نظر سے احوال و واقعات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات محقق ہو جاتی ہے کہ انگریزوں اور سید صاحب کے مابین کبھی ایک لمحہ کیلئے بھی جنگ نہیں ہوئی ۔

بلکہ ہر دو فریق نے اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر ”کچھ لو اور کچھ دو کے نظریہ کے تحت“ ایک دوسرے کیساتھ بھرپور تعاون کیا تھا انگریزوں کے دور میں انھیں ہر طرح کی سہولت حاصل تھی حتی کہ ان حضرات نے انگریزوں ہی کے دور میں مجاہدین کی فوج بنائی ۔ رضاکار تیار کئے ۔

جہاد کے لئے پورے ملک کا دورہ کیا۔ غریبوں، فقیروں، امیروں وزیروں سے چندے جمع کئے راجوں، نوابوں اور بڑے بڑے جاگیرداروں کی حاضری دی اور بنام جہاد تعاون حاصل کیا۔ اسلحے اکٹھے کئے گئے۔ حرب وضرب کی تربیت دی گئی۔ جنگ کی منصوبہ بندی ہوئی۔ اور بغیر جنگ کے غازی تیار کئے گئے اور نہ صرف یہ کہ انگریزوں نے انکی تیاریوں سے چشم پوشی کی۔ بلکہ ان کی تیاریوں میں ان سے تعاون کیلئے واضح احکامات بھی جاری کئے گئے۔ اس سلسلے میں سفری سہولتوں کا اسطرح بندوبست تھا کہ انگریز پورے پورے قافلے کا کھانا پکوا کر حاضری دیتے تھے آخر کیوں ...؟

ان حضرات کی یہ ناز برداری کیوں کیجاتی تھی۔ بلکہ متعلقہ حکام کو یہ تنبیہ کیجاتی تھی کہ انھیں خبردار کچھ نہ کہا جائے۔ یہ ہماری دردسری کا باعث نہیں بنیگے سرکار کو ان سے کوئی خطرہ نہیں ہے، جناب حسین احمد صاحب مدنی لکھتے ہیں۔

> سید صاحب کا مقصد ہندوستان کے ہندو اور مسلمان دونوں کو ایسٹ انڈیا کے تسلط واقتدار سے نجات دلانا تھا انگریز خود اسے محسوس کرتے اور اس تحریک سے بہت مخالف تھے اس بنا پر جب سید صاحب کا ارادہ سکھوں سے جنگ کرنیکا ہوا تو انگریزوں نے اطمینان کے سانس لیا اور جنگی ضرورتوں کے مہیا کرنے میں سید صاحب کی مدد کی
>
> (نقش حیات ص ۴۱۹)

ع آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ یہاں فرماتے ہیں کہ ارادہ سکھوں سے جنگ کرنیکا ہوا۔ آگے فرمائینگے سکھ نہیں، مراد انگریز تھے۔

مولانا مدنی کی منطق

مولانا مدنی اور انکی کتاب "نقش حیات" دونوں ہی عجیب ہیں۔ گاندھوی فلسفہ کے بھرپور حامل ومتبع رہاں بھی اور وہاں بھی" یہ بھی، مقصد تھا اور وہ بھی" اگر جناب مدنی کی صرف اس کتاب کا تجزیہ کیا جائے تو اس کے لئے یقیناً ایک الگ کتاب کی ضرورت ہو گی مثلاً اسی کتاب کے ص ۴۲۳ پر تحریر فرماتے ہیں۔

سکھوں سے جنگ فرقہ واریت کی بنا پر نہیں تھی بلکہ اس بنا پر تھی کہ وہ انگریزوں کے حلیف اور مددگار تھے انگریزوں نے انکو ہندوستان میں اپنی حکومت کی حفاظت کیلئے افغانستان کے راستے میں سد سکندری اور آہنی دیوار بنایا تھا اسی لئے ان کا قلع قمع کرنا لازمی تھا

(نقش حیات صفحہ ۴۲۳)

آپ یہاں کیا سمجھینگے یہی ناکہ اپنی اس آہنی دیوار میں رخنہ ڈالنے کیلئے اور اپنی سد سکندری کو مسمار کرنے کیلئے جناب سید احمد بریلوی اور انکے غازیوں کی مدد شروع کردی اور انھیں بندوقوں سنگینوں اور تیر و تفنگ سے آراستہ کر کے کہا کہ جاؤ پہاڑوں میں جاؤ اور جہاد کے نام پر ہماری آہنی دیوار کو مسمار کر کے ثواب دارین حاصل کرو۔

کیا انگریز اتنے ہی احمق اور بیوقوف تھے کہ اپنی ہی دیواریں تڑوانے کیلئے سید صاحب کو ہتھیار فراہم کر دیتے۔ اور کیا انگریز ہندوستان میں اتنے ہی کمزور تھے کہ سید صاحب اور مولوی محمد اسماعیل صاحب سے خوفزدہ ہو کر انھیں مسلح کرنے لگے تھے۔ اور غضب یہ کہ انھیں تحریک جہاد کیلئے سفری سہولتیں مہیا کر رہے تھے کہ مزید طاقتور ہو جائیں۔ ان توجیہات سے کوئی سادہ مرید تو مطمئن ہو سکتا ہے مگر ان وضاحتوں سے دوسرے لوگوں کو مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا مدنی کی یہ بیڈھب منطق صرف انکے ارادت مند شاگردوں کے کام آسکتی ہے دوسروں کی فراست اسکی بلندی کو نہیں چھو سکتی۔

اس سلسلے میں ایک اور بات بھی قابل توجہ ہے کہ سید صاحب اور انکے شریک کار امیروں جاگیرداروں، راجوں، نوابوں کے پاس کھلے عام جایا کرتے تھے اور ان سے ہر قسم کا تعاون حاصل کرتے تھے۔ کیا برٹش گورنمنٹ اتنی ہی بے خبر تھی کہ اسے انکی سرگرمیوں کا علم نہیں ہوتا تھا؟ حالانکہ انگریز گورنمنٹ کبھی بھی، کسی دور میں بھی اتنی غافل اور بے خبر نہیں رہی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس نے نہ تو سید صاحب سے باز پرس کی اور نہ ہی اپنے وفادار نوابوں اور جاگیرداروں سے کچھ پوچھا۔ پھر کیا کہا جائے۔ بات بڑھ جائیگی یاران چمن جانے دو

مقصد جہاد کی وضاحت

مولانا مدنی مقصد جہاد پر بھی بحث فرماتے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں

جہاد سے آپکا مقصد خود اپنی حکومت قائم کرنا ہرگز نہیں تھا بلکہ دین رب العلمین کی خدمت تھا

(نقش حیات صـ۴۲۱)

اور پھر اس خدمتِ دین رب العلمین کی وضاحت فرماتے ہوئے لکھتے ہیں

بیشک سید صاحب جگہ جگہ اعلائے کلمۃ اللہ اور دین رب العلمین کی خدمت کا ذکر کرتے ہیں اور اسی کو اپنی مساعی کا محرک بتاتے۔ لیکن آپ خوب سمجھتے تھے کہ کہ اعلائے کلمۃ اللہ کا ذریعہ صرف یہی نہیں ہے کہ ایک فرقہ وار گورنمنٹ قائم کیجائے۔ اور خود حاکم بنکر دوسرے برادران وطن کو اپنا محکوم بنایا جائے۔ بلکہ اس کا سب سے زیادہ موثر طریقہ یہ ہے کہ۔ برادران وطن کو سیاسی اقتدار میں اپنا شریک کر کے اسلامی فضائل اخلاق سے انکے دلوں کو فتح کیا جائے۔ اقلیت واکثریت کے مسئلہ کی کوئی پیچیدگی آپ کے ذہن میں نہیں تھی۔ کیونکہ آپکے نزدیک یہ دونوں بے حقیقت چیزیں تھیں۔ جو اپنے عمل میں زیادہ پر جوش، فدا کار سرگرم اور مخلص و دیانتدار ہوگا امامت اور لیڈر شپ اسی کے ہاتھ میں ہوگی خواہ اقلیت کے فرقہ سے یا اکثریت کے فرقہ سے

(نقش حیات صـ۴۲۲)

یہاں اسکی تشریح میں اسکے علاوہ کیا کہا جا سکتا ہے کہ

لیکن غلاموں میں ایسے اصحاب علم وفضل ایسے ارباب فہم و دانش ایسے صاحبان زہد وتقوی ایسے حاملان کتاب وسنت بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں جو کافروں اور مشرکوں کے زیر سایہ زندگی بسر کرنے کے ذوق وشوق میں اپنے ہم مذہبوں اور ہم قوموں سے جہاد کر سکتے ہیں

(قائد اعظم محمد علی جناح اور انکا عہد صـ۲۹۵)

مسلمانوں ہی کے لہو سے چٹانوں کو تر بتر کر سکتے ہیں۔ انکے لئے انکے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں۔ مگر برادران وطن کی محبت میں مذہب وملت کے اصولوں کو بدلا جا سکتا ہے

جناب بنگلوری فرماتے ہیں

ذاتی اعتبار سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو مسلمانوں سے بظاہر کوئی تعصب نہیں تھا بلکہ ہندوستان کی دیگر اقوام کے مقابلہ میں مسلمان سکھ قوم سے قریب تر تھے۔ اگر سکھوں کو اور رنجیت سنگھ کو مسلمانوں سے تعصب ہوتا تو پیرزادہ عزیز الدین انکے وزیر اور معتمد خاص کیوں ہوتے اور انکے توپ خانہ کا افسر اعلیٰ الہیٰ بخش کیوں ہوتا اور وہ توپ خانہ الہیٰ بخش کے نام سے کیوں موسوم ہوتا مگر انکی فوج اور انکے سردار یقینی طور پر بے قابو تھے۔

دہلی کی مغلیہ سلطنت جب کمزور ہوئی تو مرہٹوں نے شمالی ہند پر حملہ کر کے ملک کے بڑے حصہ پر قبضہ کیا۔ مرہٹوں اور راجپوتوں کی ریاستیں عرصہ دراز سے قائم تھیں اس لئے وہ ملک داری اور حکمرانی کے طریقوں سے بخوبی واقف تھے اور اپنی رعایا کے مذہبی جذبات کا پاس ولحاظ کرتے تھے چنانچہ مرہٹوں نے مسلمانوں کی عدالتوں کو جو قاضیوں کے تحت میں تھیں بجنسہ قائم رکھا اسی وجہ سے مسلمانوں نے انکی عملداری کو دار الاسلام قرار دیا جہاں جہاد لازم نہیں آتا

مسلمانوں کا روشن مستقبل صنہ ۱۳

تو پھر سید صاحب نے بلا وجہ جہاد کا گورکھ دھندا پھیلایا تھا۔ وزیر بھی مسلمان تھا، توپ خانہ کا افسر بھی مسلمان تھا۔ اور سکھ مسلمانوں سے قریب تر بھی تھے۔ اب ہم کیا بتائیں کہ ہندوستان کے صدر ذاکر حسین بھی مسلمان تھے، کانگریس کے صدر ابوالکلام بھی مسلمان تھے اور دوسری اقوام میں بڑے بڑے کرتا دھرتا بھی مسلمان تھے، مگر اس سے کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے بہی خواہ بھی تھے۔ جہاں ضمیر کا سودا سونے کے سکوں سے ہو جائے وہاں مسلمانی کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ اور پھر مرہٹوں سے بھی جہاد ناروا تھا۔ انگریزوں سے جہاد نادرست، ہندو برادران وطن، سکھ غیر متعصب اور قریب تر، مرہٹے کی حکومت دار الاسلام۔ پھر جھگڑا کیا تھا۔ کیا بہناروں لیے صد مسلمانوں کا قتل عام کرنے گئے تھے

سیاسی بلیک میلنگ

انگریزوں سے جہاد کے سلسلے میں جو بات سمجھ میں آسکتی ہے وہ یہ ہے کہ ان حضرات کے دوسرے تیسرے دور میں انگریزوں سے جہاں کہیں بھی جنگ وجدال کی نوبت آئی وہ صرف سیاسی مفاد کا ٹکراؤ تھا دوسرے لفظوں میں اگر اسے سیاسی بلیک میلنگ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ جب تک انگریزوں اور وہابیوں کا مفاد مشترک رہا کبھی ایک دن بھی ٹکراؤ نہیں ہوا۔ انگریز مدد کرتا رہا اور مجاہدین سکھوں سے کم (کیونکہ وہ قریب تر تھے) اور بقول انکے مسلمان کافروں۔ افغانی منافقوں، پٹھان مشرکوں سے زیادہ جنگ کرتے رہے۔

اور اگر یہ صحیح ہے کہ اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ تو ہمیں کہنے دیجیے کہ ہم بیٹوں کو دیکھ کر باپوں کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ یہاں سالہا سال پر پھیلی ہوئی تاریخ کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو سودے بازی کا ایک نہ ٹوٹنے والا تسلسل نظر آتا ہے۔ مثلاً یہ کہ مولانا حسین احمد صاحب مدنی نے قائد اعظم سے تیس ہزار روپے طلب کیے۔ مگر قائد اعظم نے انکار کر دیا۔ تو پٹیل سے ابوالکلام صاحب کی معرفت ساٹھ ہزار میں سودا ہو گیا اور برادران طن بن گئے۔ جناب مفتی محمود صاحب نے جناب شورش کے قول کے مطابق صدر جنرل محمد ایوب خاں صاحب سے دو لاکھ روپے میں اپنے ووٹ کا سودا کیا تھا۔ اسی طرح جناب ذوالفقار علی بھٹو سے سودے بازی ہوئی اور سرحد کے وزیر اعلیٰ بنے حاصل یہ کہ جہاں سے کچھ مل گیا وہ برادر رہے ورنہ نہیں تو سیاسی بلیک میلنگ جاری۔ اور یہ جراثیم چھوٹوں سے لیکر بڑوں تک میں یکساں طور سے موجود ہیں۔ یہاں بجا طور سے کہنا پڑتا ہے کہ

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنھیں تصویر بنا آتی ہے

بہر صورت اس جہاد میں۔ پٹھانوں نے تلوار کا جواب تلوار سے دیا۔ اور سکھوں نے انگریزوں سے صلح کرلی اور مولوی اسماعیل دہلوی اور سید احمد بریلوی فتح کے یقینی الہامات سمیت قتل کر دیئے گئے تو پہلا دور ختم ہوا۔ اور ایک نئے دور کا آغاز ہوا

چالباز گورے

اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزوں کی چال بہت گہری تھی۔ وہ بیک وقت تین قوتوں کو کمزور کر رہے تھے "سکھوں، پٹھانوں اور سید صاحب کے مجاہدین" کی

انگریز نہ صرف یہ کہ پورا برصغیر ہڑپ کرنا چاہتے تھے بلکہ انکی حریص نگاہیں کابل وغزنی سے گزرتی ہوئی سمرقند و بخارا کو پار کر رہی تھیں چنانچہ جب تک وہابی سکھوں اور پٹھانوں سے ٹکراتے رہے ۔ انگریز نہایت خاموشی سے حالات کا جائزہ لیتا رہا اور دونوں فریقوں کو اپنے مشوروں سے سرفراز کرتا رہا ۔ اور جب اُسے یقین ہوگیا کہ پٹھان اور سکھ دونوں ہی کمزور ہوگئے ہیں تو انہوں نے سکھوں سے صلح کرلی اور مجاہدین کو جنگ بندی کا حکم دیدیا ۔ (تفصیل آگے آرہی ہے)

مجاہدین کا پہلا، دوسرا اور تیسرا دور

حاصل یہ کہ ۱۸۳۱ء میں جنگ بالاکوٹ کے بعد تحریک مجاہدین کا دور اول ختم ہوگیا اور اس دور میں مجاہدین کی انگریزوں سے کوئی جنگ نہیں ہوئی ۔

۱۸۴۰ء میں مولوی نصیر الدین کے انتقال کے بعد (بقول مولانا مہر اور ایوب قادری) تحریک مجاہدین کا دوسرا دور بھی ختم ہوا اور اس میں بھی انگریزوں سے جہاد کا کوئی اتا پتا نہیں ملتا بالآخر ۱۹ اکتوبر ۱۸۴۶ء میں مولانا ولایت علی کو تحریک مجاہدین کی قیادت سپرد ہوئی اور یہاں سے اس تحریک کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے ۔ حالات و واقعات جناب ایوب قادری سے سنئے ۔

> مولانا ولایت علی نے تحریک مجاہدین کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی اسوقت کشمیر کے راجہ گلاب سنگھ اور مجاہدین کے درمیان جنگ چھڑی ہوئی تھی راجہ کو شکست ہوئی اور اس نے انگریزوں کے سایہ میں جاکر پناہ لی جو اسوقت تک پنجاب کے ایک حصے پر قابض اور ملکی معاملات میں پوری طرح دخیل ہو چکے تھے ۔ مارچ ۱۸۴۹ء میں تمام پنجاب پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا ۱۸۴۹ء سے تحریک جہاد کا ایک نیا موڑ شروع ہوتا ہے ۔ چونکہ ابتک مقابلہ سکھوں سے تھا اس لئے سرکار کمپنی خاموش تھی۔
>
> جب پنجاب پورے طور انگریزوں کے قبضے میں آگیا تو مجاہدین کی سرگرمیاں انگریزی حکومت کو ایک نظر نہ بھائیں ۔
>
> حکومت کے پیدا کردہ حالات سے مجبور ہوکر مولانا ولایت علی اور اُنکے بھائی مولانا عنایت علی اپنے وطن پٹنہ پہنچے اور وہاں مجسٹریٹ کے سامنے دوسال کیلئے مچلکے دیئے
>
> (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء)

کیا انصاف پسند حضرت جناب ایوب قادری کی مندرجہ بالا عبارت پر غور کرنیکی زحمت کرینگے۔ اس عبارت سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ ۱۸۴۹ء تک انگریزوں سے جنگ نہیں ہوئی۔

اور اس روایت کے بعد یہ بات بھی ناقابل یقین ہے کہ انگریز مجاہدین سے خوفزدہ تھے اور اسی خوفزدگی کیوجہ سے انگریز مجاہدین کیلئے اسلحہ فراہم کرتے تھے۔

اور یہ کہنا کہ حضرت مجاہدین خالص لوجہ اللہ جہاد فرماتے تشریف لے گئے تھے تو یہ بات بھی محل نظر ہے۔ ورنہ بتایئے کہ وہ کیا مصلحت تھی کہ ولایت علی اور عنایت علی صاحبان کو جہاد ترک کر کے بلند و بالا پہاڑوں سے نیچے اترنا پڑا حیات سید احمد شہید کے حوالہ سے کل محمد صاحب فیضی اپنی کتاب آزادی کی ان کہی کہانی میں لکھتے ہیں۔

> جب گلاب سنگھ اور سرکار انگریزی کا آپس میں معاہدہ ہوگیا تواسوقت سرکار انگریزی نے ایک خط بنام مولوی ولایت علی صاحب لکھا کہ اب گلاب سنگھ سرکار انگریزی کی حمایت میں ہے اسوقت اس سے لڑنا عین گورنمنٹ سے لڑنا ہے لہذا تم کو چاہیے کہ اسکے ساتھ لڑائی بند کردو۔
>
> (آزادی کی ان کہی کہانی)

اور پھر اس حکم نامہ کے تحت جنگ بندہوگی فیضی صاحب لکھتے ہیں

> اس کے بعد لڑائی بند کردی، ہتھیار سرکار کے پاس جمع کروادیئے اور قیمت وصول کرلی اور انگریزوں نے مجاہدین کا شاندار استقبال کیا اور انکی دعوتیں بھی کیں۔
>
> (آزادی کی ان کہی کہانی ص۲۶۴)

ان واقعات کی تفصیل (حیات سید احمد شہیدؒ) سے بھی ملاحظہ فرمائیں۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری لکھتے ہیں

> اسوقت انگریزی سرکار نے ایک خط بنام مولوی ولایت علی صاحب اس مضمون کا لکھا کہ گلاب سنگھ نے سرکار انگریزی سے معاہدہ کیا ہے۔ اور اس معاہدہ کے بموجب وہ گورنمنٹ انگریزی کی حمایت میں ہے اسوقت اس سے لڑنا عین گورنمنٹ سے لڑنا ہے لہذا تم کو چاہیئے کہ اب اسکے ساتھ لڑائی بند کردو۔
>
> (حیات سید احمد شہید ص۳۲۹ جعفر تھانیسری)

ص ۳۴۰ پر لکھتے ہیں ۔

اس وقت مجاہدین اور روہیلہ فوج لڑنے کی تیار تھی مگر مولوی ولایت علی صاحب نے لڑنے کو قرین مصلحت نہ سمجھ کر انگریزی سرکار کے افسروں کی اطاعت قبول کر لی

(حیات سید احمد شہید ص ۳۴۰)

مولانا ولایت علی کی لاہور میں آمد

یہ دونوں حضرات (یعنی میر اولاد علی اور مولوی ولایت علی) مع فوج و توپ خانہ وغیرہ سامان جنگ کے لاہور پہنچے ۔ ان ایام میں جان لارنس صاحب بہادر پنجاب کے چیف کمشنر تھے چیف کمشنر صاحب بہادر نے دو منزل آگے بڑھ کر مولوی صاحبوں کا استقبال کیا اور نہایت گرم جوشی سے ان کو لاہور لائے اور بہت تعریف اور مدح و شجاعت اور ہمدردی ان حضرات کی کر کے ۔ ضامن شاہ رئیس بالاکوٹ پر اسکی بیوفائی کیوجہ سے بہت تقریر کی اور بہت سی گفتگو کے بعد جان لارنس صاحب بہادر اور ان دونوں حضرات کے درمیان یہ بات قرار پائی کہ دونوں حضرات مع ان ہندوستان مجاہدین کے اپنے وطن کو واپس جائیں اور تمام اسلحہ جات مع توپ خانہ انگریزی سرکار کے ہاتھ فروخت کر کے روہیلوں کی بقایا تنخواہیں دے کر انکو برخواست کر دیں ۔

(حیات سید احمد شہید ص ۳۴۱)

اور یہی تھانیسری صاحب لکھتے ہیں ۔" آخر کار ۱۸۴۵ء یعنی معرکہ بالاکوٹ کے پندرہ برس بعد کل سلطنت پنجاب متعصب سکھوں کے ہاتھ سے نکل کر ہماری عادل سرکار کے قبضہ میں آگئی ۔ کتاب مذکور ص ۲۹۱ "

مجاہدین کی دعوتیں اور پٹنہ کو روانگی

دعوتوں کے سلسلے میں ہم دو حوالے " سیرت سید احمد شہید مصنفہ جناب ابوالحسن علی ندوی ص ۱۱۷ اور ص ۲۱۹ سے اپنی کتاب " ہاتھی کے دانت " میں لکھ چکے ہیں ۔ اور وضاحت کی ہے کہ یہ مجاہدین حضرات کسطرح انگریزوں کی دعوتیں اڑایا کرتے تھے ۔ اور انگریز کسطرح انکے لئے کھانے پکوایا کرتے

صہ ہاتھی کے دانت ۔ مکتبہ فریدیہ سے طلب فرمائیں

کر چشم براہ رہا کرتے تھے وہ جہاد سے پہلے کی ابتدائی دعوتیں تھیں اور اب حصول مراد کے بعد کی دعوتیں بھی دیکھئے۔

> سر جان لارنس صاحب بہادر نے ایک روز گورنمنٹ انگریزی کیطرف سے مولوی صاحب کی مع کل مجاہدین کے دعوت کی اور دوسرے روز خود صاحب ممدوح نے اپنی طرف سے قافلہ کی دعوت کی تیسرے روز مولوی رجب علی صاحب نے جو چیف کمشنری پنجاب کے میر منشی تھے دعوت کی اسکے بعد اپنے خرچ سے انگریزی سرکار نے باہتمام و اکرام مولوی صاحب کو مع بقیہ مجاہدین کے پٹنہ پہنچا دیا۔
>
> (حیات سید احمد شہید ص ۳۴۲)

یہ تمام باتیں ہمارے اس موقف اور نظریات کی تائید کرتی ہیں کہ۔ ان مجاہدین نے انگریزوں سے کبھی بھی کوئی باقاعدہ جنگ نہیں کی بلکہ انگریزوں کی سازش کا شکار ہوئے، یا پھر انگریزوں سے سیاسی سودے بازی کرتے رہے یعنی ادھر تم اُدھر ہم، مگر انگریز ان سے کہیں زیادہ چالاک تھا اس نے انکی ہر سیاست پٹ کر دی اور وہابی اسٹیٹ کے قیام کا خواب درہم برہم ہو گیا۔

ان حضرات نے انگریزوں کے عطا کردہ ہتھیاروں کے بل بوتے پر سکھوں سے جنگ کی۔ پٹھانوں کو پامال کیا۔ اور انگریزوں کی گلاب سنگھ کی صلح کے بعد ہتھیار مع توپ خانہ انگریزوں کو واپس کر دیئے (اور انعام بنام فرنگی ہتھیار حاصل کئے)

البتہ پٹھانوں کا قتل بنام جہاد بطور منافع ملا۔ اس باب میں جناب مسعود عالم صاحب ندوی رقمطراز ہیں

> اس وقت کشمیر کے راجہ گلاب سنگھ اور مجاہدین کے درمیان جنگ ہو رہی تھی۔ راجہ کو شکست ہوئی اور اس نے انگریزوں کے سائے میں جا کر پناہ لی جو اسوقت تک پنجاب پر قابض ہو چکے تھے حکومت نے مولانا ولایت علی کو اطلاع دی کہ اب گلاب سنگھ پر حملہ خود انگریزی حکومت سے لڑائی مول لینا ہوگا
>
> حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ مجاہدین کے ذریعہ سکھوں کی طاقت توڑ دی جائے اسلئے شروع شروع میں مجاہدین سے روک ٹوک نہیں کی گئی لیکن پنجاب کا اکثر حصہ انگریزوں کے قبضے میں آگیا تو مجاہدین حکومت کی نگاہ میں کھٹکنے لگے۔ مجاہدین بھی

خوامخواہ حکومت سے برسرِ پیکار ہونا خلاف مصلحت سمجھتے تھے
(ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۵)

گیا اس روایت کے بعد بھی کوئی شک و شبہ رہ جاتا ہے۔ یہی بات جو سید صاحب کے بہت بڑے حمایتی نے کہی ہے اگر کوئی اور کہدیتا تو خوفناک دھماکوں سے زمین تھرا اٹھتی۔ مگر یہ بات جناب مسعود عالم صاحب ندوی نے فرمائی ہے اس لئے اسٹیج خاموش ہے۔ ظاہر ہے کہ گلاب سنگھ "نام نہاد مجاہدین" اور انگریزوں کے دباؤ کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا وہ انگریزوں کے زیر سایہ آگیا۔ اور یہی انگریزوں کا مقصد تھا جو تیسرے دور میں پورا ہو گیا۔

ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب مجاہدین کا اصل مقصد انگریزوں سے جہاد تھا۔ یعنی پہلے سکھوں کو ختم کرکے۔ بلکہ اس سے بھی پہلے پٹھان مشرکوں کی صفائی تھی۔ پھر سکھوں کی پھر انگریزوں سے اصلی جہاد تھا تو سکھوں کے خاتمہ کے بعد توپ خانہ انگریزوں کے حوالے کیوں کر دیا گیا اصل جہاد تو اب شروع ہونا تھا پھر خلاف مصلحت اور "خوامخواہ" کیوں ہو گئی۔ بقول جرا

کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا   آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

بڑے حضرت کا الہام اور چھوٹے حضرت کی تاویل

یوں تو سید بادشاہ الہاموں کے بادشاہ

بھی تھے پوری تاریخ نت نئے الہاموں سے لبریز ہے اگر ان بڑے حضرت کے الہامات ہی جمع کئے جائیں تو یقیناً ایک ضخیم کتاب جمع ہو سکتی ہے۔ مگر ہم یہاں بطور تبرک مولوی محمد جعفر تھانیسری کی کتاب "حیات سید احمد شہید" سے صرف "اقتباس" درج کرتے ہیں اور قارئین کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

(۱) سید محمد یعقوب کی روایت سید محمد یعقوب آپکے بھانجے سے روایت ہے کہ بروقت روانگی خراسان آپ اپنی ہمشیرہ یعنی والدہ سید محمد یعقوب سے رخصت ہونے لگے تو آپ نے اُن سے فرمایا کہ اے میری بہن میں نے تم کو خدا کے سپرد کیا۔ اور یہ بات یاد رکھنا کہ جب تک ہند کا شرک اور ایران کا رفض اور چین کا کفر اور افغانستان کا نفاق میرے ہاتھ سے محو ہو کر، ہر مردہ سنت زندہ نہ ہو جائے گی اللہ رب العلمین مجھکو نہیں اٹھائے گا

اگر قبل از ظہور ان واقعات کے کوئی شخص میری موت کی خبر تم کو دے اور تصدیق پر حلف بھی کرے کہ سید احمد میرے روبرو مر گیا یا مارا گیا تو تم اسکے قول پر ہرگز اعتبار نہ کرنا کیونکہ میرے رب نے مجھے وعدہ واثق کیا ہے کہ ان چیزوں کو میرے ہاتھ پر پورا کریگا

(حیات سید احمد شہید محمد جعفر تھانیسری ص۱۸۲)

۲۔ بلاخطہ مکتوبات احمدی جس میں سید صاحب کا اصل کا فی الضمیر بڑی صراحت کیساتھ بیسیوں مختلف واقعات پر ظاہر کیا گیا ہے اور اکثر مولفوں کی تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ "وعدہ فتح پنجاب" کے الہام کا آپکو ایسا وثوق تھا کہ آپ اسکو سراسر صادق اور ہونیوالی بات سمجھ کر بارہا فرمایا کرتے تھے اور اکثر مکتوبات میں لکھا کرتے تھے کہ اس الہام میں جو وسوسہ شیطانی اور شائبۂ نفسانی کو ذرا بھی دخل نہیں ہے۔ ملک پنجاب ضرور میرے ہاتھ پر فتح ہوگا اور اس فتح سے پہلے مجھکو موت نہ آئے گی لیکن واقعہ بالاکوٹ "خواہ شہادت ہو خواہ غیبوبت" بظاہر اس یقینی الہام کے سراسر خلاف ہوا اب اس کا جواب یہی ہے کہ از روئے اصول شریعت محمدی کے الہام ایک ظنی چیز ہے اور اسکی تاویل وغیرہ میں سو طرح کی غلطیوں کا گمان ہوتا ہے۔ یہ تو ضرور ہوا کہ وقوعہ کے پندرہ برس بعد سلطنت پنجاب متعصب اور ظالم سکھوں کے ہاتھ سے نکل کر ایک ایسی عادل اور آزاد اور لامذہب قوم کے ہاتھ میں آگئی کہ جسکو ہم مسلمان اپنے ہاتھ پر فتح ہونا تصور کر سکتے ہیں اور غالباً سید صاحب کے الہام کی صحیح تاویل یہی ہوگی جو ظہور میں آئی۔

حیات سید احمد شہید ص۲۹۱

دیکھئے یہ کیا کہہ رہے ہیں یعنی انگریزوں کی فتح کو ہم مسلمان اپنی ہی فتح تصور کرتے ہیں۔ کیا اس سے گہرا ربط بھی ممکن ہے۔ اور یہ کیوں نہ ہو کہ سید صاحب اور انکے مقلدین انگریزوں کی حکومت اور عملداری کو اپنی ہی عملداری سمجھتے تھے۔ ع ببیں تفاوت رہ از کجا است تا بکجا

عبید اللہ سندھی اور شیخ اکرام کی گواہی

یہ دونوں حضرت سید صاحب کے مداحین میں ہیں انکی گواہی یقیناً مضبوط گواہی ہے، جناب عبید اللہ سندھی

کا واقعہ محمد سرور صاحب افادات وملفوظات مولانا عبید اللہ سندھی میں لکھتے ہیں ۔

> ایک مرتبہ میں سرحد یاغستان کے مقام پر گیا ۔۔۔ میں اس امید میں کہ شاید سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی جماعت مجاہدین میں زندگی کی کوئی کرن دکھائی دے ادھر چلا یا وہاں پہنچ کر جو کچھ میں نے دیکھا وہ حد درجہ افسوسناک اور قابل رحم تھا وہاں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ جماعت جو مجاہدین کے نام نامی سے یاد کیجاتی ہے کس بری حالت میں ہے اور اسکی گذران اور اسکی زندگی کس طرح صاحبزادہ عبدالقیوم خاں کی وساطت سے انگریزی حکومت کی رہین منت ہے
>
> (از امتیاز حق ص ۱۷ راجہ غلام محمد)

تقریباً یہی بات جناب شیخ محمد اکرام صاحب نے بھی کہی ہے مگر انداز میں کچھ فرق ہے (زبان دبی دبی سی ہے اور لہجہ مدہم مدہم سا) پھر بھی اگر غور کیا جائے تو بات سمجھ میں آجاتی ہے فرماتے ہیں ۔

> بلکہ کبھی کبھی تو یہ خیال آتا ہے کہ بعض سربرآوردہ مجاہدین (مثلاً مولانا محمد بشیر جنکے مولانا مہر بیحد مداح ہیں ۔ اور جنھیں امیر حبیب اللہ خاں بارہ ہزار روپے سالانہ تنظیمی اخراجات کیلئے دیا کرتے تھے) دوسری قوتوں کا آلۂ کار تو نہیں بن گئے تھے امیر نعمت اللہ کے زمانے میں اسمست کے جو چشم دید حالات مولانا محمد علی قصوری نے لکھے ہیں ان کو پڑھ کر طبیعت کو دکھ ہوتا ہے ۔
>
> (موج کوثر ص ۵۷)

مولانا محمد بشیر کی کہانی

یہ تو جناب شیخ اکرام کا ارشادہ ہے ورنہ وہ باتیں جو جناب محمد علی قصوری نے تحریر فرمائی ہیں قاری کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں مولوی بشیر احمد کا اصل نام مولوی عبدالرحیم تھا قصوری صاحب فرماتے ہیں کہ یہ بڑی قابلیت اور سیاسی سوجھ بوجھ کے مالک تھے ۔ یہ امیر صاحب (امیر حبیب اللہ) سے رقم لیکر چلے گئے اور ایک مہینہ کے بعد واپس آئے تو بیحد کامیاب تھے گویا انھوں نے امیر صاحب کا کام کر دیا تھا اور یاغستان کے علاوہ سے امیر صاحب کی اطاعت کے خطوط حاصل کر لئے تھے ۔ دوسرے لفظوں اُن مجاہدین کو

جو امیر حبیب اللہ اور انگریز دونوں قبضے میں نہیں تھے انہوں امیر حبیب اللہ کا مطیع کر دیا گیا۔ دوسرے لفظوں میں امیر حبیب اللہ کی اطاعت انگریزوں کی اطاعت تھی۔ امیر حبیب اللہ ان اطاعتی خطوط سے اتنے خوش ہوئے کہ انھیں ملا بشیر کا خطاب عطا فرما دیا بلکہ یو ٹے یاغستان کیلئے اپنی طرف سے مختار نامزد کر دیا امیر حبیب اللہ کو انگریزوں نے تخت نشین کیا تھا اور ۱۲ لاکھ سے اٹھارہ لاکھ روپے صرف اس لئے ادا کرتے رہے تھے کہ امیر صاحب افغانی قبائل کو ہندوستان پر یلغار کرنے سے روکتے رہینگے اور امیر حبیب اللہ غالباً یہ کام مولوی بشیر سے لیتے تھے۔

اگر تاریخ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بالکل روشن ہو جاتی ہے کہ امیر حبیب اللہ دوسری پالیسی پر عمل کرتے تھے ایک طرف انگریزوں کو وفاداری کی یقین دہانی کرواتے تھے اور وظیفہ وصول کرتے تھے دوسری طرف مجاہدین سے وعدہ وعید کرتے رہتے تھے تاکہ بوقت ضرورت کام آئیں۔

کیا شیخ صاحب نہیں جانتے کہ بات جب دکھ کی ہو تو دکھ ہی ہوتا ہے۔ مداحین حضرات بڑے جتن سے مجاہدین کی شان و عظمت کا ایک گھروندا بناتے ہیں اور پھر اچانک ہی حقائق کا ایک جھونکا ریت کے ان گھروندوں کو نابود کر دیتا ہے۔

ازمشاہدات کابل و یاغستان

زیر قلم سطور کے بارے میں یہ خاکسار بھی وہی کچھ عرض کریگا جو مولانا محمد علی قصوری نے لکھا ہے کہ ان حالات و واقعات کو پڑھ کر عبرت حاصل کیجائے جناب قصوری تحریر فرماتے ہیں

> زبردست اسلاف کے جانشین نہایت نالائق اور نااہل لوگ بن گئے۔ جنہوں نے عقیدت سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور اس روپیہ کو جو جہاد کیلئے بھیجا جاتا تھا اپنی عیش پرستیوں کیلئے برباد کرنا شروع کیا۔ چونکہ اس جماعت کے سرحدی لیڈروں کی سرگرمیاں پچھلے پچاس سال میں نہایت شرمناک رہی اور وہ عام مشائخ اور پیروں کیطرح ہر قسم کے فریب اور جھوٹ سے اپنی دکان کی رونق بڑھاتے رہے ہیں اور ہندوستان کے نہایت مخلص آدمیوں کو بھی اپنا آلہ کار بنانے سے نہیں چوکے (اور میں خود بھی انکے فریب کا شکار رہ چکا ہوں) اس لئے میں

چاہتا ہوں کہ انکے پوست کندہ حالات بیان کروں اور مجھے ان کے درمیان رہ کر جن حالات کا علم ہوا انھیں جماعت اہل حدیث اور عام مسلم پبلک کے فائدے کیلئے بے نقاب کردوں تاکہ لوگ آیندہ انکی دھوکہ بازیوں سے بچیں۔

(مشاہدات کابل و یاغستان صہ ۹۳)

مجاہدین کا بیت المال

جسکے بلا شرکت غیرے مالک امیر المجاہدین جناب نعمت اللہ صاحب تھے اور اللہ کی یہ تمام نعمتیں انھیں کے لئے وقف تھیں، وہی اسکے مالک و مختار تھے جسکو چاہتے نعمتوں سے نوازتے اور جس کو چاہتے محروم کردیتے۔ جناب قصوری لکھتے ہیں۔

کسی شخص کو بیت المال کے متعلق امیر صاحب سے سوال کرنیکا حق نہ تھا میں نے سُنا کہ بعض گستاخوں نے بیت المال کے متعلق سوال کرنیکی جسارت کی مگر اسکا جواب یہ ملتا کہ رات کو چپکے سے امیر صاحب کے معتمد انھیں ختم دیتے تھے۔ اور پھر اسکا ذکر بھی کوئی نہ کرتا تھا۔

(مشاہدات کابل و یاغستان صہ ۹۰)

امیر نعمت اللہ اور پہاڑوں کی بیٹیاں

محل وقوع کے اعتبار سے وہ علاقہ نہایت حسین، پر فضا، جنت نظیر تھا۔ پھولوں، بنفشہ زاروں کی بہتات تھی، چشموں کی فراوانی نے ہر طرف حسن و شادابی بکھیر رکھی تھی۔ مولانا محمد علی نے ان علاقوں کے حسن کے وجمال کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے، لکھتے ہیں جب میں وہاں پہنچا تو اس جماعت کی عنانِ اقتدار امیر نعمت اللہ کے ہاتھوں ہی میں تھی۔

امیر نعمت اللہ مرحوم .... مسلمان امراء و مشائخ کیطرح عورتوں کے بیحد شوقین تھے تین تو ان کی نکاحی بیویاں تھیں اور دس بارہ نہایت خوبصورت لڑکیاں بطور خادماؤں کے رکھتے تھے امیر حبیب اللہ خاں کیطرح امیر نعمت اللہ کا بھی زیادہ وقت انھیں نوجوان لڑکیاں سے لہو ولعب میں گذرتا تھا

(مشاہدات کابل و غستان صہ ۱۰۸)

۷ ایک خاص حلقہ ان لوگوں کا تھا جو امیر صاحب کے حوالی موالی تھے انھیں اپنی خدمات کے صلے میں امیر صاحب ہمیشہ داد و دہش سے نوازتے رہتے تھے ان سے بعض لوگ تو امیر صاحب کے جاں نثار خدام میں سے تھے جو امیر صاحب کے اذنی اشارے پر ہر قسم کے جرائم کرنے پر آمادہ و تیار رہتے تھے

مثلاً اگر امیر صاحب کی خادماؤں میں سے کوئی لڑکی حاملہ ہو جائے تو اسکے بچے کو پیدا ہونے کے بعد گلا گھونٹ کے چپکے سے دریا برد کر دینا امیر صاحب کی عادت تھی — ان خادماؤں کو اکثر بدلتے رہتے تھے۔ جو خادمائیں اسطرح الگ کیجاتی تھیں۔ انکی شادیاں انھیں لوگوں میں سے کسی ایک سے کر دی جاتی تھی۔ اور اُسے نہایت عمدہ جہیز اور ماہوار خرچ ملتا تھا اور یہ امر اس درجہ افسوسناک تھا کہ ان میں سے جو لڑکی غیر معمولی طور پر خوبصورت ہوتی وہ شادی کے بعد بھی امیر صاحب کی توجہات کا مرکز بنی رہتی۔

(مشاہدات وکابل و یاغستان ص۱۱)

ایک اور اندوہناک انکشاف

بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ اور ان سے چھوٹے ماشاء اللہ

اور انکا مجموعہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اگر یہ لوگ واقعی ایسے ہی تھے جیسا کہ مولانا قصوری نے تحریر فرمایا۔ بلکہ یہ لوگ یقیناً اسی فطرت کے تھے تو انھیں کیا کہا جائیگا۔

کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ ان کا سارا پروگرام ہی سومناتھ کے پنڈتوں کیطرح تھا "باہر بھگتی اندر بھگتی" اور انکی خفیہ کاروائی تو بالکل ہی مندروں میں رہنے والے جاں نثاروں کیطرح تھی

— میں جب سے ان معاملات واقعات کی تحقیق کر رہا ہوں (جو اب بھی جاری ہے) ایک خیال بار بار میرے ذہن کو جھنجھوڑتا رہا ہے۔ کہ یہ لوگ ہندوستان آکر اپنے بال بچوں میں رہ کر دوبارہ کیوں پہاڑوں کیطرف نکل جاتے تھے۔ اسکی وجہ صرف اور صرف یہ تھی کہ ان حضرات نے پہاڑوں میں بھی "بال بچے" بنائے ہوئے تھے اور بے شمار چندوں پر عیش کرتے تھے

پھر انھیں ان شاداب وادیوں کو چھوڑ کر اور انکی حسین تتلیوں سے منہ موڑ کر ہندوستان میں رہنے کی کیا ضرورت تھی ۔ اب سنئے نعمت اللہ کے بعد امیر برکت اللہ کی داستان دل گداز جناب قصوری لکھتے ہیں ۔

> امیر نعمت اللہ کے بعد انکے برادر امیر رحمت اللہ جماعت میں صاحب اثر و رسوخ تھے مگر چونکہ بیت المال امیر نعمت اللہ کے قبضے میں تھا اس لئے ہر شخص امیر صاحب کی نظر عنایت کا محتاج تھا ورنہ فاقہ کشی سے خاتمہ یقینی تھا۔ امیر نعمت اللہ نے اس قدر ہوشیاری سے اپنا جال پھیلا رکھا تھا کہ کوئی شخص انکے سامنے دم نہ مار سکتا تھا
>
> رحمت اللہ بھی اپنے بھائی کیطرح بہت بدچلن اور آوارہ مزاج نوجوان تھے ۔ اگر امیر نعمت اللہ کو لڑکیوں کی رغبت نے معطل کر رکھا تھا تو انہیں نوجوان لڑکوں کی محبت نے دنیا و مافیہا سے بے خبر بنا رکھا تھا ....
>
> امیر نعمت اللہ کی اولاد نرینہ میں سے سب سے بڑا لڑکا برکت اللہ تھا ۔ یہ غالباً اسوقت نوسال کا تھا لڑکا خاصا خوبصورت اور بگڑا ہوا صاحبزادہ تھا ہر وقت دو تین اوباش نوجوان اسکی مصاحبت میں رہتے اس لئے اس کا آوارہ ہونا لابدی تھا
>
> (مشاہدات کابل و یاغستان صفحہ ۱۱۱)

شرمناک ہتھکنڈے

ایک تھے مولوی ولی محمد صاحب جنکا نام مولوی محمد موسیٰ رکھا گیا تھا حال یہ تھا کہ شاذ و نادر ہی کوئی اصلی نام سے رہتا تھا مثلاً یہ کہ جناب مولوی محمد علی صاحب کا نام بھی محمد سلیمان رکھا گیا تھا۔ حال یہ کہ مولوی ولی محمد صاحب پنجاب کے نہایت مخلص کارکن تھے ۔ بے شمار چندہ بھیجا کرتے تھے یہ جب وہاں پہنچے تو ۔ قصوری صاحب سے

> امیر نعمت علی نے مولوی محمد موسیٰ کو (ولی محمد کو) اپنے ہاتھ میں لینے کیلئے پہلے انکی شادی ایک خوبصورت لڑکی سے کر دی اسکے چند ماہ بعد ایک دوسری خوبصورت لڑکی

... سے ان کی شادی کر دی اب ان کی دو بیویاں ہوگئیں ۔ پھر یہ نتیجہ نکلا ولی محمد صاحب یعنی محمد موسیٰ صاحب بالکل مفلوج ہو گئے جناب قصوری صاحب انکی زبانی لکھتے ہیں ۔ کہ

> پہلے اُنہوں نے امیر نعمت اللہ کی بدعنوانیاں، ان کا عورتوں کیساتھ شفقت انکی جہاد سے غفلت و اعراض جماعتی فنڈ کو اپنے اغراض مشؤمہ کی تکمیل کیلئے بے دریغ استعمال کرنا سب پیش کئے ۔ اور کہا کہ مجھے تو شرم آتی ہے کہ میں پنجاب میں اس کے متعلق اتنا جھوٹا پروپگنڈا کرتا رہا اور لوگوں کو جماعت کے فرضی کارناموں کی داستانوں سے اپنی طرف مائل کرتا رہا یہاں آکر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں پنجاب میں حالت خواب میں تھا اور اب آنکھیں کھلی ہیں تو ایک بھیانک منظر سامنے ہے ۔
>
> (مشاہدات کابل و یاغستان ص ۱۱۳)

ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ مجاہدین کی اکثر داستانیں فرضی اور جھوٹی ہیں ۔

مولانا قصوری کا اظہار حقیقت : بلا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے

یہ مسئلہ کہ انقلابی تحریکیں لیڈر پیدا کرتی ہیں یا لیڈر اپنی ہوشیاری، تدبر اور قربانی و ایثار سے انقلابی تحریکوں کو چلاتے یا کامیاب بناتے ہیں مرغی اور انڈے کی پیدائش کے مسئلے کیطرح لاینحل ہے مگر ہم نے تو آزما کر دیکھا کہ اکثر تحریکیں لیڈروں کی ناعاقبت اندیشی یا بزدلی سے ناکام ہوگئیں۔

ہندوستان میں ہم نے مسلمانوں کی مذہبی تنظیم کی تحریک اُٹھائی مگر اس میں بھی غلطی یہ کی کہ ۔ مولانا ابوالکلام کو امام الہند بنا کر تمام تحریک ان کے بل بوتے پر کھڑی کی لیکن عین وقت پر مولانا آزاد کی بزدلی نے تمام کھیل بگاڑ دیا ۔ اور سارے کا سارا محل جسکی تعمیر پر لاکھوں روپیہ صرف ہوا تھا اور سیکڑوں مسلمانوں نے اسے اپنے خون سے سینچا مولانا کی گریز پائی کیوجہ سے آن کی آن میں دھڑام سے نیچے آگرا ۔

اس طرح سلطان ابن مسعود کی تحریک "الاخوان" جسکے متعلق اچھے اچھے مبصروں کا خیال تھا کہ عرب کی کایا پلٹ دے گی وہاں لیڈروں کی نالائقی اور کوتاہ اندیشی کا شکار ہوگئی یہی حال ہماری تحریک کا ہوا ۔ ہماری تحریک ایک نہایت زبردست انقلابی تحریک تھی مگر اس کا

گو امیر حبیب اللہ کی ذات بھی اور اپنے حسن ظن یا ناتجربہ کاری کی بنا پر نہ سوچا کہ امیر حبیب اللہ اپنی فطرت کو کیونکر ترک کر سکتا ہے۔

(ص ۶۹ مشاہدات کابل و یاغستان)

انگریزوں کے دوست

جناب ایوب قادری صاحب اپنی کتاب "جنگ آزادی ۱۸۵۷ء" میں علمائے اہل سنت پر خاصے برہم نظر آتے ہیں۔ اور کہیں کہیں تو خوب گرجے برسے بھی ہیں۔ جناب قادری کی نظر میں وہابیوں کی پامالی اور شکست کی تمامتر ذمہ داری علمائے اہل سنت پر عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے سنی علماء پر خاصی تنقید فرمائی ہے۔ مگر اسکے ساتھ ہی لگے ہاتھوں وہابیوں کا بھی تیا پانچا کر ڈالا ہے۔ اور شاید جوش وجذبہ میں بہت سی ڈھکی چھپی باتوں کا اظہار بھی ہو گیا ہے۔ لکھتے ہیں

> مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی نے سرکار برطانیہ کی وفاداری میں جہاد کی منسوخی پر ایک مستقل رسالہ "الاقتصاد فی مسائل الجہاد" ۱۲۹۲ھ میں لکھا انگریزی اور عربی زبانوں میں اسکے ترجمے ہوئے۔ یہ رسالہ سر چارلس ایچیسن اور سر جیمس لائل گورنران پنجاب کے نام معنون کیا گیا۔
>
> جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ص ۶۲

یہی نہیں بلکہ اس کار خیر کیلئے ملک کے دور دراز علاقوں کا سفر بھی کیا اور ملک بھر کے علمائے اہل حدیث سے توافق و تائید بھی حاصل کی جناب مسعود عالم صاحب ندوی لکھتے ہیں

> اس کتاب پر مولوی محمد حسین بٹالوی انعام سے بھی سرفراز ہوئے جماعت اہلحدیث کو فرقے کی شکل دینے میں ان کا خاص حصہ ہے اور یہ بزرگ ہیں جنھوں نے اس سادہ لوح فرقے میں وفاداری کی خو لو پیدا کی۔ نہ صرف یہ ہوا بلکہ معاصر علماء سرکاری مخالفت کے طعنے بھی دئیے۔
>
> (ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۲۱۲)

یہی مولانا ندوی اس کتاب میں فرماتے ہیں۔

> معتبر اور ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ اسکے معاوضہ میں سرکار انگریزیہ سے انھیں

> جاگیر بھی ملی تھی اس رسالہ کا پہلا حصہ پبلش نظر ہے۔
>
> (ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک صہ ۲۹

اگر بغور دیکھا جائے تو پوری کتاب تحریف و تدلیس کا عجیب و غریب نمونہ نظر آئے گی۔ مولوی عبد المجید خادم سوہدروی سیرت ثنائی کے صہ ۳۷۲ میں جو کچھ لکھا ہے۔ اُسے جناب ایوب قادری بیان فرماتے ہیں۔

> مولوی محمد حسین بٹالوی نے اشاعۃ السنہ کے ذریعہ اہل حدیث کی بہت خدمت کی لفظ وہابی آپ ہی کی کوشش سے سرکاری دفاتر اور کاغذات سے منسوخ ہوا اور جماعت کو اہل حدیث کیساتھ منسوب کیا گیا آپ نے حکومت بھی کی اور انعام میں جاگیر بھی پائی
>
> (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء صہ ۶۵

غلامی کی فخریہ پیشکش

اگر ان حضرات سے یہاں یہ کہدیا جائے کہ بتوں سے تجھکو امیدیں خدا سے ناامیدی۔ تو ناراض ہوجائینگے اور عبدیت کا سارا جاہ وجلال غریب علمائے اہلسنت کیطرف اُلٹ پڑے گا۔ حیرت ہے کہ یہاں اُنکی خودساختہ توحید میں ذرا بھی فرق واقع نہیں ہوتا۔

اور یہاں یہ بھی یاد رہے کہ اس سلسلے میں بٹالوی صاحب نے متعدد درخواستیں بھی دی تھیں۔ گورنروں کی خوشامدیں اور چاپلوسیاں بھی کی تھیں اور کاسہ لیسی کی انتہا کردی تھی جناب ایوب قادری لکھتے ہیں!

> اس گروہ اہلحدیث کے خیر خواہ و وفادار رعایا برٹش گورنمنٹ ہونے پر ایک بڑی اور روشن اور قوی دلیل یہ ہے کہ یہ لوگ برٹش گورنمنٹ کے زیر حمایت رہنے کو اسلامی سلطنتوں کے ماتحت رہنے سے بہتر سمجھتے ہیں
>
> اور اس امر کو اپنے قوی وکیل (اشاعۃ السنہ) کے ذریعہ سے جس کے نمبر ۱۰ جلد ۶ میں اس امر کا بیان ہوا ہے اور وہ نمبر ہر ایک لوکل گورنمنٹ و گورنمنٹ آف انڈیا میں پہنچ چکا ہے گورنمنٹ پر ظاہر اور مدلل کر چکے ہیں جو آج تک کسی اسلامی

> فرقہ رعایا گورنمنٹ نے ظاہر نہیں کیا اور نہ آیندہ کسی سے ظاہر ہونیکی امید ہو سکتی ہے
> (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ص ۶۶)

ان واقعات کی تفصیلات اشاعۃ السنہ لاہور جلد ۶ شمارہ ۱۰ اور ۲۹ ماثر صدیقی ص ۱۶۲ میں بھی ملاحظہ کیجا سکتی ہیں اسی طرح ملکہ وکٹوریہ کے جشن جوبلی پر جو اڈریس مولوی محمد حسین بٹالوی نے گروہ مسلمانان اہلحدیث کیطرف سے پیش کیا تھا اُسے بھی ایوب قادری کی زبانی ہی سنتے چلیں

> یہ مذہبی آزادی اس گروہ کو خاصکر اس سلطنت میں حاصل ہے بخلاف دوسرے اسلامی فرقوں کے کم ان کو اور اسلامی سلطنتوں میں بھی آزادی حاصل ہے اس خصوصیت سے یہ یقین ہو سکتا ہے کہ اس گروہ کو اس سلطنت کے قیام اور استحکام سے زیادہ مسرت ہے اور ان کے دل سے مبارکباد کی صدائیں زیادہ زور کیساتھ نعرہ زن ہیں
> جنگ آزادی ۱۸۵۷ء

سرکار پرستی اپنے عروج پر

کیا یہ تصویر اُنھیں لوگوں کی نہیں؟ جنکی بے پناہ انگریز دشمنی کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے جنکی شجاعت و بہادری کے نقارے بجائے جا رہے ہیں اور جن کی دینی غیرت کے ترانے گائے جا رہے ہیں

ہمارا خیال ہے کہ حکم جہاد کی منسوخی پر صرف دو ہی گروہ نے فتاوے شایع کیے ہیں ایک قادیانیوں نے دوسرے انکے ہم قافیہ وہابیوں نے

قادیانیوں نے بھی برٹش گورنمنٹ کو غنیمت اور ذریعہ نجات سمجھا اور وہابیوں نے بھی انگریزی سرکار کو سایۂ وہاب سمجھا قادیانی بھی انگریزی حکومت کو مسلمانوں کی حکومت پر ترجیح دیتے تھے اور وہابی بھی انگریزوں ہی کو ماوی ملجا سمجھتے تھے قادیانیوں کی مربی بھی یہی سمندر پار کی مخلوق تھی اور وہابیوں کے سرپرست بھی یہی گورے لوگ تھے

قادیانیوں کو بھی کسی دوسری اسلامی سلطنت میں جائے پناہ نہیں تھی اور وہابیوں کو بھی کوئی حکومت خوش آمدید کہنے کیلئے تیار نہیں تھی

جناب ایوب قادری نے وہابیوں کی بابت بہت کچھ لکھا ہے۔ مگر اصل بات لکھنے

سے شاید وہ بھی کترا گئے ہیں۔ اسوقت ہمارے پیش نظر بھی "الاقتصاد فی مسائل الجہاد" حصہ اول ہے جو ۱۸۷۶ء میں لکھا گیا یوں تو اس کی ایک ایک سطر قابل دید بلکہ لائق عبرت ہے، مگر ہم صرف ضرورۃ ایک دو حوالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ بٹالوی صاحب لکھتے ہیں

> مفسدہ ۱۸۵۷ء میں جو مسلمان شریک ہوئے تھے وہ سخت گنہگار اور بحکم قرآن وحدیث وہ مفسد و باغی بدکردار تھے۔ اکثر ان کے عوام کالانعام تھے بعض جو خواص علماء کہلاتے تھے وہ اصل علوم دین و قرآن سے بے بہرہ تھے یا نافہم و بے سمجھ باخبر اور سمجھدار علماء اس میں ہرگز شریک نہیں ہوئے اور نہ اس فتویٰ پر جو اس غدر کو جہاد بنانے کیلئے مفسد لئے پھرتے تھے انہوں نے خوشی سے دستخط کئے اسکی تفصیل ہم اشاعۃ السنہ ۱۱ ج ۵ میں کرچکے ہیں
>
> یہی وجہ تھی کہ مولوی اسماعیل دہلوی جو حدیث و قرآن سے باخبر اور اس کے پابند تھے اپنے ملک ہندوستان میں انگریزوں سے جنکے امن و عہد میں رہتے تھے نہیں لڑے اور نہ اس ملک کی ریاستوں سے لڑے
>
> (الاقتصاد فی مسائل الجہاد حصہ اول ص ۵)

اسے دروغ گوئی کی انتہا کہا جائے یا چاپلوسی کی حد آج تک مجاہدین آزادی ۱۸۵۷ء کے متعلق اتنی دل آزار باتیں شاید انگریزوں نے بھی نہ کہی ہوں جتنی ان خوشامدی لوگوں نے کی ہیں آزادی کے متوالوں، وطن کے پاسبانوں کو مفسد، گناہگار، باغی، بدکردار کہنا صرف انھیں لوگوں کو زیب دے سکتا ہے جنکے دلوں سے ایمان وغیرت کی آخری کرن بھی خارج ہوچکی ہو اور خواص علمائے کرام کو علوم دین سے بے بہرہ اور ناسمجھ کہنا کمینگی کی انتہا ہے۔ بہرصورت

> مولوی اسماعیل نے یہ اعلان دیدیا تھا کہ سرکار انگریزی پر نہ جہاد مذہبی طور پر واجب ہے نہ ہی اس سے مخاصمت ہے صرف ہم سکھوں سے اپنے بھائیوں کا انتقام لیتے ہیں یہی وجہ تھی کہ حکام انگلیشیہ کو بالکل خبر نہ ہوئی اور نہ انکی تیاری پر مانع ہوئے
>
> (حیات طیبہ ص ۲۰۱)

اور یہی مرزا حیرت چند صفحات کے بعد لکھتے ہیں

گورنمنٹ خوب جانتی ہے کہ اسکی سلطنت کی برکتوں کو فرقہ اہلحدیث نے کسی قدر تسلیم کیا ہے اور اسکے کیسے فرماں بردار اور مطیع اس گروہ کے لوگ ہیں

(حیات طیبہ صفحہ ۲۲۷)

جناب رئیس احمد جعفری تحریر فرماتے ہیں

مولوی نذیر حسین جو وہابیوں کے مقتدا اور پیشوا تھے انکے گھر میں تو ایک میم چھپی بیٹھی تھی

(بہادر شاہ ظفر اور انکا عہد صفحہ ۵۲۱)

اور جناب ایوب قادری لکھتے ہیں۔

مولوی میاں نذیر حسین ابن جواد علی . . . . نے تو ایک طرف جہاد کے فتوے پر دستخط کیے اور دوسری طرف ایک انگریز مسز لیسن کو بھی پناہ دی

(جنگ آزادی ۱۸۵۷ء صفحہ ۱۱۳)

اور پھر لکھتے ہیں مولوی نذیر حسین کو اس صلے میں ایک ہزار تین سو روپے نقد انعام ملا۔ اس سلسلے میں ایک سرٹیفکیٹ میاں نذیر حسین کی سوانح عمری سے نقل کیا جاتا ہے

دہلی مورخہ ۲۷ ستمبر ۱۸۷۰ء ڈبلیو جی واٹرفیلڈ قائم مقام کمشنر دہلی مولوی نذیر حسین اور انکے بیٹے شریف حسین اور انکے دوسرے گھر والے غدر کے زمانہ میں مسز لیسن کے جان بچانے میں ذریعہ ہوئے۔ حالت محرومی میں انہوں نے ان کا علاج کیا ساڑھے تین مہینہ اپنے گھر میں رکھا اور بالآخر دہلی کے برٹش کیمپ میں ان کو پہنچا دیا

(جنگ آزادی ۱۸۵۷ء صفحہ ۱۱۴ بحوالہ الحیات بعد المماث)

جناب ایوب قادری اس کتاب کے صفحہ ۱۱۳ پر لکھتے ہیں

ان لوگوں کو اس خدمت کے صلے میں مبلغ دو سو اور چار سو روپے ملے تھے مبلغ سات سو روپے بابت تاوان منہدم کیے جانے مکانات کے ان لوگوں

کو عطا کئے گئے تھے۔ مسز لیسن کی جان بچانے میں شمس العلما ڈپٹی نذیر احمد بھی شامل تھے اور بقول افتخار عالم مارہروی اس انگریز خاتون کو وہی اُٹھا کر لائے تھے

(جنگ آزادی ۱۸۵۷ء)

نتائج

ان احوال و واقعات کے پیشِ نظر کوئی بھی ذی فہم قاری حسب ذیل نتائج اخذ کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

- سید صاحب اور انکے مجاہدین کے تذکرہ لکھنے والے حضرات نے حقائق سے زیادہ عقیدت وارادت سے کام لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ واقعاتی شواہد انکا ساتھ نہیں دیتے۔
- سید صاحب اور مولوی محمد اسماعیل صاحب دہلوی کے تذکرہ نگار اس بات پر مصر اور بضد ہیں کہ صورت حال کچھ بھی کیوں نہ ہو وہ بہر حال اُنکی عظمت و شان بلند کرنیکی کوشش کرتے رہینگے۔
- سید صاحب کے مورخ اس باب میں خود مضطرب ہیں کہ واقعۃً جہاد کن لوگوں سے ہوا انگریزوں سے یا سکھوں سے۔ تاریخی حقائق انگریزوں سے جنگ کی نفی کرتے ہیں۔ اس باب میں کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ تاریخ میں انھیں کے مورخین نے تحریف کی ہے۔ یعنی انگریزوں کے بجائے سکھ لکھدیا گیا ہے مگر واقعات سکھوں ہی سے جنگ ثابت کرتے ہیں۔
- مقصد جہاد میں حکومت الہیہ کا قیام ایک غلط پروپگنڈہ ہے کیونکہ جناب مولانا مدنی اسے فرقہ وارانہ گورنمنٹ قرار دیتے ہوئے اس عظیم مقصد کی تردید کر رہے ہیں اور پھر یہ کہ خود مقصد جہاد میں اضطراب پایا جاتا ہے۔
- گذشتہ شہادتوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس جہاد میں انگریزوں نے سید صاحب کیساتھ بھرپور تعاون کیا تھا اور سید صاحب اور مولوی محمد اسماعیل صاحب اور انکے مجاہدین اپنے نہ ماننے والوں کو فنا کر دینے کا عزم رکھتے تھے۔ اور اُنہوں نے امامت و بیعت کی آڑ میں خونریزی کا جواز پیدا کیا تھا۔

- سید صاحب کے مورخ بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ سید صاحب اور انکے مجاہدین فرنگی چال اور انکی سازش کا شکار ہو گئے تھے۔
- اور یہ کہ وہابی (اہلحدیث) انگریزوں کے انتہائی مطیع وفرماں بردار تھے اور سرکاری انعام یافتہ لوگوں میں تھے۔
- اور یہ کہ وہابی انگریزی حکومت کو مسلمانوں کی حکومت سے بہر صورت اچھا جانتے تھے اور یہ کہ وہابیوں نے جہاد جیسے اہم فریضہ کو انگریزوں کیلئے منسوخ قرار دیا تھا۔

جنگ حریت ۱۸۵۷ء

حیرت انگیز باتیں

جنگ آزادی کا دور انتہائی بھیانک اور خوفناک دور تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے برصغیر کا چپہ چپہ لہو میں ڈوب گیا تھا۔ ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔ ہندوستان کی مہکتی ہوئی شاداب سرزمین بارود کی ناگوار بو سے معمور ہوگئی تھی دردناک چیخوں لرزہ خیز کراہوں، دلگداز آہوں کیساتھ ہی حریت پسندوں، آزادی کے متوالوں کے پرجوش نعروں سے ارض وسما کی پنہائیاں تھرا رہی تھیں۔ مجاہدین کی فائرنگ اور فرنگی توپوں کی گھن گرج سے دھرتی کا وسیع سینہ کانپ رہا تھا۔ ہر گلی، ہر کوچہ، ہر محلہ لاشوں سے ٹپا پڑا تھا۔ بڑے بڑے کوئیں عصمت مآب لڑکیوں اور عورتوں کی لاشوں سے لبریز ہو گئے تھے۔ مردوں نے خود بھی اپنی بہنوں بیٹیوں اور بیویوں کی گردنیں کاٹ کر گولیوں سے چھلنی ہو گئے تھے۔ بڑا ہی دردناک دور تھا۔ جب دہلی ہی نہیں ہر قابل ذکر شہر کی ہر گلی میں پھانسیوں کے پھندے نظر آرہے تھے۔ ہر محلہ میں درجنوں لاشیں اپنی بیکسی کا ماتم کر رہی تھیں۔

اس دور میں رونما ہونیوالے احوال وواقعات اور اسکے اسباب وبواعث پر ہنوز تحقیقات جاری ہیں۔ محققین الجھی ہوئی گتھیاں سلجھا رہے ہیں۔ اور بہت سی ایسی باتوں کا ظہور ہو رہا ہے۔ جسکا وہم وگمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جیسے جیسے ماضی کے دبیز پردے ہٹتے جاتے ہیں۔ بے شمار ان کہی کہانیاں جنم لیتی جا رہی ہیں۔

(۲) وہ مورخین حضرات (جنکی اکثریت اب بھی اُس مکتبۂ فکر سے وابستہ ہے جنھوں نے جانبداری اختیار کر کے تاریخ کیساتھ ناانصافی کی ہے) اس بات میں سخت مضطرب نظر آتے ہیں۔

اس مکتبۂ فکر کے مورخین حضرات فرماتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء علماء دیوبند اور اس سے متعلقین حضرات نے انگریزوں سے سخت جنگ پیکار کی انہوں نے مفسدوں سے (جدید مورخین کی رائے میں انگریزوں سے) نہایت خوفناک مقابلے کئے، قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں اور اس راہ میں ظلم وستم کے نشانے بنے۔ (مگر یہ حضرات انگریزوں کے باب میں دستاویزی ثبوت مہیا کرنے سے قاصر ہیں) اس کے ساتھ ہی سوانح نگار حضرات نے ایسی حیرت انگیز قلمکاریاں فرمائی ہیں۔ اور ایسی عجیب وغریب حکایات وروایات پیش کی ہیں کہ پڑھ کر عقل دنگ رہجاتی ہے۔

مثلاً جناب ایوب قادری صاحب اپنی کتاب جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا یعقوب علی صاحب نانوتوی کی کتاب "سوانح عمری مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی مطبوعہ دیوبند" کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں۔

> چند بار مفسدوں سے نوبت مقابلوں کی آگئی اللہ رے مولوی صاحب (محمد قاسم نانوتوی) ایسے ثابت قدم تلوار ہاتھ میں اور بندوقچیوں کا مقابلہ۔ ایک بار گولی چلی رہی تھی کہ یکایک سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ جس نے دیکھا جانا گولی لگ گئی۔ ایک بھائی دوڑ پڑے پوچھا کیا ہوا۔ فرمایا سر میں گولی لگی۔ عمامہ اُتار کر دیکھا تو کہیں گولی کا نشان تک نہیں ملا اور تعجب یہ ہے کہ خون سے کپڑے تر تھے انھیں دنوں ایک نے بندوق ماری جسکے سنبھے سے ایک مونچھ اور کچھ داڑھی جل گئی اور کچھ قدرے آنکھ کو نقصان پہنچا خدا جانے گولی کہاں گئی۔
>
> جنگ آزادی ۱۸۵۷ء صفحہ ۸۲ تا صفحہ ۹۲ ایوب قادری

اب ان حضرات کو کون بتائے کہ شیشے کے محل میں بیٹھ کر پتھر بازی کا شغل مناسب نہیں ہوتا۔ یہ روایت بداہتہً روایت کے خلاف ہے تلوار بمقابلۂ بندوق تو خیر شاعرانہ بات ہے ہی۔ مگر تعجب یہ ہے کہ سر میں لگنے والی گولی کہاں گئی۔ حالانکہ "مجاہد کبیر" فرما رہے ہیں کہ گولی سر میں لگی ہے۔ اور انتہائی حیرت ناک بات یہ ہے کہ سر میں گولی کا نشان تک نہیں ہے

اور اس سے بھی زیادہ خوفناک بات یہ تھی کہ کپڑے خون سے تر بتر تھے۔

غالباً اس کو کرامت کہتے ہیں! یہاں اس موقع پر یہ کہا جائے کہ یہ ساری روایت ہی مولانا یعقوب علی صاحب کی کرامت ہے تو شاید کچھ نہ غلط نہ ہو۔

بہرصورت جب مورخین فرماتے ہیں کہ ان حضرات نے جہاد فرمایا تو ہمیں کیا انکار ہو سکتا ہے۔ ضرور جہاد فرمایا ہو گا۔ مگر حریت پسندوں، آزادی کے متوالوں سے اور یہی صحیح ہے۔ ویسے ہم تو اس بات کے بھی قائل ہیں کہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں بہت سے ہندوں نے بھی حصہ لیا تھا اور ثابت قدم رہے تھے۔

مگر ان علمائے کرام کے سیرت نگار حضرات جو افسانے اور کہانیاں سناتے ہیں وہ یقیناً تعجب خیز اور محل نظر ہیں۔ اس باب میں تقریباً تمام داستان گو حضرات نے "تذکرہ الرشید مولانا عاشق الٰہی" کو ماخذ بنایا ہے۔ اور یہ تذکرہ ایسے افسانوں اور کہانیوں کا مجموعہ ہے جسمیں اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور اس بے اعتباری میں دور جدید کے مورخین بھی ہمارے ساتھ ہیں۔

پھر یہ کہ سیرت نگار حضرات نے اُن واقعات کو یکسر اور عمداً نظر انداز کر دیا ہے جو انکے مقاصد کی نفی کرتے تھے۔ البتہ مولانا مہر نے لیا ہی ایک واقعہ لکھ کر بڑی اچھی ہوئی تاویل فرمائی ہے۔ ممکن ہے مولانا مہر کی اس تاویل کو عقیدت مند لوگ ارادت کی جھونک میں قبول کر لیں مگر افسوس کہ ہر قاری اس سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔

مولانا عاشق الٰہی کے بیان کے مطابق ایک مرتبہ حاجی امداد اللہ صاحب علیہ الرحمہ، مولانا رشید احمد صاحب مولانا محمد قاسم صاحب اور حافظ ضامن صاحب کا مقابلہ بندوقچیوں سے ہو گیا۔

(یہ نبرد آزما جتھا سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے والا یا ہٹ جانیوالا نہ تھا اسلئے اٹل پہاڑ کیطرح پرا جما کر ڈٹ گیا اور سرکار پر جاں نثاری کیلئے تیار ہو گیا۔ اللہ رے شجاعت و جوانمردی کہ جس ہولناک منظر سے شیر کا پتا پانی اور بہادر سے بہادر کا زہرہ آب ہو جائے۔ وہاں چند فقیر ہاتھوں میں تلواریں لئے۔ جم غفیر بندوقچیوں کے سامنے ایسے جمے رہے گویا زمین نے پاؤں پکڑ لئے ہیں۔ چنانچہ آپ پر فیریں ہوئیں حضرت حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ زیر ناف گولی کھا کر شہید ہو گئے)

(۱۸۵۷ء کے مجاہد ص ۲۵۳ تذکرہ الرشید حصہ اول ص ۷۵)

مولانا مہر کی تاویل

چونکہ مولانا عاشق الٰہی کی اس عبارت پر یہ اعتراض کیا گیا تھا کہ "یہ پوری جماعت برٹش گورنمنٹ کی بہی خواہ تھی اور یہ مجاہدین کے بجائے سرکاری لوگ تھے۔ اور یہ کہ انگریزوں کیطرف سے حریت پسندوں سے برسرِ آزما ہوئے تھے۔ لہٰذا ضروری تھا کہ مولانا مہر حسب توقع اسکا دفاع کرتے۔ چنانچہ مولانا مہر تاویل فرماتے ہیں کہ

> مبادا سرکار کے باغیوں کے الفاظ سے غلط فہمی پیدا ہو یہاں "سرکار" سے مراد خود حضرت حاجی صاحب ہیں اور مقابلہ اُن لوگوں سے تھا جو انگریزوں کے طرفدار ہو کر آئے تھے لیکن سرکار کا لفظ ایسے طریقے پر استعمال کیا گیا کہ بظاہر اس سے حکومت مراد لی جاسکتی ہے۔
>
> "تذکرہ الرشید" ایسے زمانہ اور ایسے حالات میں مرتب ہوئی تھی جب انگریزوں کا اقتدار اوجِ کمال پر پہنچا ہوا تھا۔ اور نازک واقعات کی ترتیب میں مرموز طریقہ اسلوب سے کام لئے بغیر چارہ نہ تھا۔
>
> یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ میری رائے اور میرا تاثر ہے اور میں اسے قطعی طور پر صحیح سمجھتا ہوں نہیں کہہ سکتا کہ مصنف مرحوم کے پیش نظر کیا بات تھی۔
>
> اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد ص ۲۵۴ مولانا غلام رسول مہر

اس مقام پر مولانا مہر نے وکالت کا حق ادا کر دیا ہے اور لفظ "سرکار" کی بہترین تاویل فرمائی ہے اسکے علاوہ اس عبارت کی بظاہر اور کوئی تاویل ممکن بھی نہیں تھی۔ مگر اس تاویل سے جسے مولانا قطعی طور پر صحیح سمجھتے ہیں اُن ٹھوس اعتراضات کی دیواریں نہیں گرائی جاسکیں جو اس راہ میں سدِ سکندری بنا کر کھڑی ہیں مثلاً یہ کہ

- انگریزوں کے دور کو مولوی محمد اسماعیل صاحب اور انکے ساتھیوں نے عہدِ امن کہا ہے اور اس سے جہاد کو ناجائز قرار دیا ہے۔ اور یہ کہ انگریزی حکومت کو اپنی حکومت اور یہ کہ انگریزوں کی فتح کو اپنی فتح قرار دیا ہے۔
- اور یہ کہ ماضی میں سید احمد صاحب بریلوی اور انکے ساتھی جہاد سے پہلے اُن سے اجازت لیکر کوئی قدم اُٹھایا کرتے تھے۔

- اور یہ کہ تاویلات میں ماہر ہونیکے باوجود علمائے دیوبند نے اس عبارت کی تاویل کرنیکی ضرورت محسوس نہیں فرمائی۔
- اور بڑی بات یہ ہے کہ مولانا مہر نے عمداً "تذکرۃ الرشید" کی اُن عبارتوں کو نظر انداز کر دیا ہے جو مولانا کی تاویل اور انکے موقف کی نفی کرتی ہیں۔

اب آپ تسلسل کیساتھ "تذکرۃ الرشید" اور "سوانح قاسمی" کی اُن عبارات کو دیکھتے جائیں جو بہرصورت مولانا مہر کی تاویل سے مطابقت نہیں کرتیں۔ اور اس سے مولانا مہر اور ایوب قادری کا تسامح کھل کر سامنے آجاتا ہے۔

لفظ سرکار کے معنی

> شروع ۱۲۷۶ھ ۱۸۵۹ء وہ سال تھا جس میں حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ) پر اپنی سرکار سے باغی ہونیکا الزام لگایا گیا اور مفسدوں میں شریک ہونیکی تہمت باندھی گی۔
>
> تذکرۃ الرشید ج اول صہ ۷۴

کیا فرماتے ہیں علمائے دین متین کہ اس لفظ سرکار سے کون لوگ مراد لئے جا سکتے ہیں۔ اور کن مفسدین سے ملنے کی تہمت باندھی گی تھی۔ اور کس سرکار سے باغی ہونیکا الزام لگایا گیا تھا۔

کیا یہاں بھی سرکار سے مراد حاجی امداد اللہ صاحب ہیں۔ اور کیا یہاں مفسدوں سے مراد انگریز یا اُنکے ساتھی بن سکتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ یہاں سرکار سے مراد برٹش گورنمنٹ ہی ہے اور مفسدوں سے مراد لازماً حریت پسند ہی ہیں۔ مولانا مہر کی تاویل اور انکی فراست کی قطعیت اپنی تمامتر خوبیوں کے باوجود نقد و نظر کی کسوٹی پہ صحیح ثابت نہیں ہوتی کیونکہ تذکرۃ الرشید کی عبارات اس تاویل کا ساتھ نہیں دے رہی ہیں۔ مولوی عاشق الٰہی لکھتے ہیں

> جن کے سروں پر موت کھیل رہی تھی اُنہوں نے کمپنی کے امن و عافیت کا زمانہ قدر کی نظر سے نہ دیکھا اور اپنی رحم دل گورنمنٹ کے سامنے بغاوت کا علم قائم کیا۔ فوجیں باغی ہوئیں، حاکم کی نافرمان بنیں قتل و قتال کا بد بازار

کھولا اور جوانمردی کے غرہ میں اپنے پیروں پر خود کلہاڑیاں ماریں۔
(تذکرۃ الرشید ج اول صـ مطبع دار العلوم دیوبند)

فرمایئے! یہاں کمپنی سے کونسی کمپنی مراد ہے۔ کیا یہاں بھی کمپنی سے خدانخواستہ حضرت حاجی صاحب کی کمپنی مراد لی جائیگی۔ اور رحم دل گورنمنٹ سے حضرت حاجی صاحب کی گورنمنٹ مراد ہو گی۔ اور فوجیں باغی ہوئیں سے حاجی صاحب کی فوجیں مراد لی جائینگی؟۔

ہمارا خیال ہے کہ مولانا مہر میں ایک مؤرخ ہونیکے باوجود مؤرخانہ فراخدلی نہیں ہے اور ان میں بھی ضد کی وہ تمام خوبیاں یا خرابیاں موجود ہیں۔ جو اس طبقہ کے علماء کرام کا خاصہ ہیں ذرا یہ بھی دیکھتے چلیں۔

مولانا (رشید احمد) سمجھے ہوئے تھے کہ جب میں حقیقت میں سرکار کا فرماں بردار ہوں تو جھوٹے الزام سے میرا بال بھی بیکانہ ہو گا اور اگر مارا بھی گیا تو سرکار مالک ہے اُسے اختیار ہے جو چاہے کرے۔

تذکرۃ الرشید جلد اول صـ

اگر تاویلات کے ذریعہ صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح ثابت کرنا مقصد ہے تو یہاں بھی تاویل فرمالیں۔ اسطرح کہ یہاں سرکار سے مراد ذاتِ رب العلمین ہے (کیونکہ ہم سب حقیقت میں اُسی کے فرماں بردار ہیں) اور یہ اس لئے کہ سرکار سے مراد یہاں حضرت حاجی صاحب بھی نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ذات باری کے علاوہ کوئی مالک ہے نہ مختار ہے۔ اور پھر "جو چاہے کرے" نے کوئی پردہ نہیں رہنے دیا۔ ع من انداز قدت را می شناسم

میاں محمد کی سنئے

سید میاں محمد صاحب (ناظم جمعیت علماء ہند) اپنی کتاب "علماء ہند کا شاندار ماضی" میں ان واقعات کو ایک نئے انداز سے ارشاد فرماتے ہیں۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ وغیرہ پر برطانوی حکومت نے فساد کا الزام لگایا اور ان بزرگوں نے اس سے انکار کر دیا۔ ان کا انکار بالکل صحیح تھا۔ کیونکہ اُنہوں نے فساد میں قطعاً حصہ نہیں لیا۔ البتہ فساد کی صورت ختم ہونیکے

بعد جب منظم جہاد کی شکل پیدا ہوئی تو اس جہاد میں ضرور بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جہاد فساد نہیں ہوتا بلکہ قاطع فساد ہوتا ہے

(علماء ہند کا شاندار ماضی ص۲۹۵ جلد چہارم طبع الجمعیۃ پریس دہلی)

کوئی شاندار ماضی کا مصنف ہے اور کوئی "روشن مستقبل کا" اور سب اپنی اپنی کہے جاتے ہیں اور تاویلات کا انبار لگا دیتے ہیں۔ مگر بات وہی صحیح ہے جو آگے آرہی ہے۔

ایک بات سمجھ میں نہیں آتی جب یہ حضرات اتنے نڈر، پرجوش، بیباک مجاہد تھے تو کسی مقام پر اقرار ہی کر لیتے کہ ہاں ہم نے انگریزوں سے جہاد کیا ہے۔ مگر ایسا نہیں کہا گیا مگر مریدین بہر صورت مجاہد بنا کر رہینگے۔

جواب چاہیئے

ہر قاری کے ذہن میں اس سوال کا پیدا ہونا ضروری ہے کہ "جواز جہاد کی وہ کونسی منظم صورت تھی جسے بنیاد بنا کر انگریزوں سے جہاد فرمایا گیا۔ کیونکہ اسی علماء ہند کا شاندار ماضی" کے مندرجات کے مطابق "اس زمانہ کی اصطلاح میں وہابی کا مطلب تھا پابند شریعت ص۱۲۶ ج۴" اور سر سید کے قول کے مطابق حال یہ تھا کہ "معزول بادشاہ کو دلی کا بہت بڑا بدعتی سمجھتے تھے اور اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ دلی کی جن مسجدوں میں بادشاہ کا قبض و دخل اور اہتمام ہے ان مسجدوں میں نماز درست نہیں چنانچہ وہ لوگ جامع مسجد میں نماز نہیں پڑھتے تھے (شاندار ماضی ج۴ ص۱۲۵" اور اسی کتاب کے ص۱۲۶ پر اس سے بھی زیادہ وضاحت ہے "دلی میں وہابی مولویوں کا گروہ بہادر شاہ کو بڑا بدعتی جانتا تھا اور ان مسجدوں میں نماز پڑھنے کو جائز نہیں سمجھتا تھا جن میں بادشاہ کیطرف سے امام مقرر ہوتا اور انکا اہتمام ہوتا ص۱۲۶ ج۴"

پھر میاں محمد اپنی کتاب شاندار ماضی ج۴ ص۱۵ پر رقمطراز ہیں۔

بیشک آج (سنہ۱۸۵۷ء) سے تقریباً تیس۳۰ سال پہلے انھیں علماء کی جماعت جن کو آج وہابی کہا جارہا ہے حضرت مولانا اسماعیل شہید اور حضرت سید احمد شہید کی زیر قیادت ان ملوکیت اور شاہنشاہیت سے دامن جھاڑ کر خلافت راشدہ کے نمونہ پر شمالی مغربی سرحدی علاقہ میں ایک حکومت قائم کر چکی تھی اور آج بھی انھیں علمائے کرام کا ایک دستہ مغل شہنشاہیت اور برطانوی سامراج دونوں کے برخلاف علم جہاد بلند کرنیکی تیاریاں کر رہا تھا الخ (شاندار ماضی ص۱۵ ج۴)

آپ ہی فیصلہ کریں کہ جو بادشاہ بدعتی تھا۔ حکومت ملوکیت تھی۔ اسکی زیر انتظام مسجدوں میں نماز بھی درست نہیں تھی اور انکے تمام اکابرین اس سے بھی تیس سال پہلے دامن جھاڑ کر جا چکے تھے۔ پھر وہاں خلافت راشدہ کا نمونہ بھی قائم کر لیا تھا۔ اور یہ کہ انگریزوں اور مغلوں دونوں ہی کے خلاف علم جہاد بلند کرنوائے تھے۔ کسطرح سلطنت دہلی کے زیر انتظام جہاد فرما سکتے تھے لہذا یہ کہنا کہ حریت پسندوں کے طرف دار ہوکر انگریزوں سے جنگ کی سراسر غلط ہے بے بنیاد اور غیر منطقی بات ہے۔ کیونکہ دہلی کی مرکزیت کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اور بغیر مرکزیت کے جہاد درست نہیں۔ اور دہلی کے علاوہ کوئی مرکزیت تھی نہیں پھر "بڑھ چڑھ کر" کسطرح حصہ لیا؟

مالیخولیا کے مریض

اب سوانح قاسمی کا وہ حوالہ بھی ملاحظہ فرمالیں جس کے بعد کسی تاویل کی گنجائش نہیں رہتی۔

> اتنی بات بہر حال یقینی ہے اور نا قابل انکار چشم دید گواہوں کا کھلا ہوا اقتضا ہے کہ مالیخولیا سے زیادہ اس قسم کی افواہوں کی کوئی قیمت نہیں ہے کہ غدر کے ہنگامہ کے برپا کرنے میں دوسروں کیساتھ سیدنا امام الکبیر مولانا محمد قاسم نانوتوی اور آپکے علمی اور دینی رفقا کے بھی ہاتھ تھے بلکہ واقعہ وہی ہے جو مصنف نے لکھا ہے کہ مولانا فسادوں سے کوسوں دور تھے۔
>
> (سوانح قاسمی جلد دوم ص ۱۰۹ طبع دیوبند)

اس عبارت کا واضح مفہوم یہ ہے کہ جو یہ کہے کہ ان علمائے کرام نے انگریزوں سے جنگ کی اور تحریک آزادی ۱۸۵۷ء میں انھوں نے کوئی کردار ادا کیا تو وہ مالیخولیا کا مریض ہے۔ مولانا اور انکے رفقاء تو اس جنگ سے کوسوں دور تھے۔

زلزلہ

کچھ عرصہ ہوا ہم نے حضرت علامہ ارشد القادری صاحب کی کتاب زلزلہ[ف] پڑھی تھی۔ بلکہ اُسکے بعد واقع ہونیوالے "دھماکہ" کا تجربہ بھی کیا تھا۔ کوئی بھی قاری "زلزلہ" پڑھنے کے بعد متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسکی شائستگی اور جاذبیت سے اپنے تو اپنے دشمن بھی انکار نہیں کر سکتے۔ مگر "زلزلہ" کے آتے ہی ان حضرات پر کچھ اسطرح زلزلہ طاری ہوا کہ الامان و الحفیظ نتیجہ۔ اس طبقہ کا ہر فرد "دھماکوں" کی نظر ہو کر رہ گیا ہے۔ اور پاک و ہند میں ایک

[ف] زلزلہ مکتبہ فریدیہ سے طلب فرمائیں

تسلسل کیساتھ "زلزلہ" کی رد میں کتابیں لکھی جا رہی ہیں مگر بات بنتی نظر نہیں آتی جسکی وجہ سے بوکھلاہٹیں عروج پر ہیں۔

ابھی حال ہی میں مولانا منظور احمد صاحب نعمانی کی زیر نگرانی جناب مولوی محمد عارف صاحب سنبھلی استاذ ندوۃ العلماء لکھنؤ نے بھی ایک کتاب بنام "بریلوی فتنہ کا نیا روپ" رقم فرمائی ہے۔ جس میں دال اَتول کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ جناب سنبھلی اپنی اس کتاب "بریلوی فتنہ کا نیا روپ" کے ص۱۶۵ پر رقمطراز ہیں۔

> اس زمانہ "یعنی ایام تحریک آزادی" میں مسلمانوں کے اندر کسی نیاز مند سرکار کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہاں مولانا ارشد القادری کے اوپر والوں میں ایسے لوگ اسوقت بھی پائے گئے ہوں تو ان کا اسے بعید نہ سمجھنا ٹھیک ہے۔ جناب ارشد القادری صاحب میں کچھ ہوش، گوش ابھی باقی رہ گیا ہو تو ہم انھیں پیر دانا شیخ سعدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نصیحت یاد دلائیں کہ ہر جگہ گھوڑا دوڑانا کی نہیں ہوتی
>
> ؎ نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن   کہ جاہا سپر باید انداختن
>
> وہ کہاں اس تاریخ جہاد بیکار کی باتوں میں اپنی ہنسی اڑوانے داخل ہو گئے انکے لئے مذہبی فتنہ انگریزی اور گندم نمائی وجو فروشی کا میدان بہت ہے
>
> (بریلوی فتنہ کا نیا روپ ص۱۶۵)

سنبھلی صاحب فرماتے ہیں کہ اس دور میں کسی نیاز مند سرکار کا تصور بھی نہیں کر سکتے، حالانکہ اس دور میں اتنے بڑے بڑے اونچے اونچے لوگ نیاز مند سرکار تھے کہ جنکا آج تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے سنبھلی صاحب کی تاریخ دانی پر حیرت ہے۔ سر سید احمد خان کون تھے شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد کون تھے، شمس العلماء میاں نذیر حسین کون تھے وغیرہ وغیرہ بے شمار خان بہادر اور شمس العلماء قسم کے لوگ اگر نیاز مند سرکار نہیں تھے تو یہ خطابات کس صلے میں عطا ہوئے تھے

اس مبلغ علم پر "سوانح قاسمی" کے مندرجات کے مطابق اگر ان محترم کو مالیخولیا کا مریض کہدیا جائے تو شاید کچھ غلط بات نہ ہوگی۔

اب انھیں کون بتائے کہ علامہ ارشد القادری کے اوپر والے بڑے جانباز لوگ تھے

وہ انکے "امام ربانی" کیطرح تسبیح دکھا دکھا کر تقیہ نہیں کرتے تھے۔ وہ انگریزوں کو آلۂ جہاد بیچ کر مجاہد نہیں کہلواتے تھے۔ اور نہ ہی جہاد کے پہلے اور جہاد کے بعد انگریزوں کی دعوت اڑایا کرتے تھے۔ اور نہ ہی انگریزوں کی عملداری کو اپنی عملداری اور انگریزوں کی فتح کو اپنی فتح ونصرت سمجھتے تھے۔ رہی جناب سنبھلی اور انکے رفقاء کی تاریخ دانی تو وہ بھی اس کتاب کے پڑھنے کے بعد ظاہر ہو جائے گی اور معلوم ہو جائیگا کہ انکی تاریخ دانی کا معیار کیا ہے۔

بہرصورت اس باب میں ہمارا موقف یہ ہے کہ ان حضرات علمائے کرام نے (جن کی دھوم مچی ہوئی ہے) جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں کوئی مجاہدانہ کردار ادا نہیں کیا ہے۔ باقی یہ تو اکثر لوگ جانتے ہیں کہ ؎ پیراں نمی پرند مریداں می پرانند۔

پروپگنڈے کے بل بوتے پر کوئی مجاہد الکبیر بنجائے یا کچھ اور "سب کچھ ہو سکتا ہے۔ چند اختلاف کے باوجود ہم یہاں اہل حدیث اہل قلم برق التوحیدی کا ایک تجزیہ نقل کرتے ہیں جو ان کے حقیقی خدوخال نمایاں کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

جماعت دیوبند ہر سہرا اپنے سر سجانیکی آرزومند ہے۔ (برق التوحیدی)

علمائے دیوبند کی ہمیشہ ایسی ہی دورخی اور منافقانہ پالیسی رہی ہے اور مستقبل کی تاریخ کے پیش نظر ابنائے دیوبند نے ہمیشہ منافقانہ کردار ادا کیا۔ آپ حیران ہوں گے کہ اگر ایک طرف تحریک ریشمی رومال کا سہرا مجاہدین چمرقند اور حمس سے چھین کر مولانا سندھی ایسے اشتراکیت اور نام نہاد انقلابی کے سر پر تھوپا جاتا ہے تو دوسری طرف اسی خاندان دیوبند کے چشم وچراغ اور ایک حلقہ کے شیخ المشائخ کے بھائی انگریز کو مخبری کرتے ہیں اور محمود الحسن کو گرفتار کروا دیا جاتا ہے۔

تحریک پاکستان میں اگر ایک طرف شبیر عثمانی کا نام لیکر آج پاکستان کے تصور سے تعمیر وتکمیل تک کو علمائے دیوبند کی کوشش کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے تو دوسری طرف مدنی جیسے مردود اقبال بھی تھے۔ کہ اگر پاکستان نہ بنتا تاریخ فیصلہ انکے خلاف دیتی تو پھر بھی علماء دیوبند ہی کی کرامات کا مظہر ہوتا۔

پھر دیکھیے ۱۹۵۳ء کو ایک تاریخ نے اسے سنہری الفاظ میں لکھا ہے تو محض اولیائے دیوبند کی برکات کا نتیجہ ہے۔ لیکن اگر تاریخ کا اونٹ دوسری کروٹ بیٹھتا تو احتشام الحق کاندھلوی، شفیع، ظفر احمد انصاری و عثمانی محمد حسن اور خیر محمد جالندھری جیسے ختم نبوت فروش علمائے دیوبند کا طرّہ آپکو سب سے زیادہ بلند نظر آئیگا۔

اسکے بعد ۱۹۷۴ء کی تحریک ختم نبوت کیطرف نظر دوڑائیے اگر مستقبل نے اسے حسین و درخشندہ تحریک قرار دیا تو کریڈٹ علمائے دیوبند کا نصیب مفروض ہوگا۔ کیونکہ بنوری کی بزرگی کا نتیجہ تھا۔ لیکن اگر وہ تحریک کوئی اور رخ اختیار کر لیتی خدانخواستہ تو پھر وہ تمغہ جرأت بھی فضلائے دیوبند ہی کو ملتا۔ کہ مولانا تھانوی اور ہزاروی اپنے پورے لاؤ لشکر سمیت بھٹو کی پشت پر تھے بالاختصار اسکے بعد آپ پاکستان کے میدان سیاست میں اتریں جسکی گہما گہمی تقریباً ایوبی دور سے شروع ہوتی ہے چنانچہ اگر حالات کا فیصلہ ایوب کے مخالفین کے حق میں ہوتا تو آپ کو یہی اہل دیوبند صف اول کے مجاہدین جمہوریت پسند نظر آئینگے۔ اور اگر حالات کا رخ دوسری طرف ہوتا تو یہی دیوبند کے خلافت راشدہ کے آخری درخشندہ ستارے سرتاج علمائے دیوبند احتشام الحق آپ کو ایوب کا استقبال کرتے اور گلے میں ہار ڈالتے (بلکہ امام ضامن باندھتے) نظر آئینگے کہ یہ ایوارڈ بھی اہل دیوبند ہی کا حصہ ہوگا اور یہ اسلئے بھی کہ حصول مفاد کیوقت تو مفتی محمود نے ایوب کو اپنا ووٹ فروخت کر دیا۔ لیکن جب تحریک چلی تو جمہوریت کے ہیرو بن بیٹھے اور تاج محمود جیسے لوگ ریحان کی معرفت رات ہی رات میں اہل ثروت صاحب معراج اور اڈیٹر لولاک بنا کر دربار ایوب میں سجدہ ریز ہوتے ہیں۔

آمدم برسر مطلب بھٹو کی حکومت کا ذکر چلیے تو آپ دیکھینگے کہ اگر بھٹو مخالفت کو تاریخ نے ترجیح دی تو یہی ابنائے دیوبند ہراول دستہ ہوں گے لیکن اگر دوسرا پہلو روشن ہوا تو یہی فرزندان دیوبند عبدالحکیم، ضیاء القاسمی، تاج محمود، عبدالقادر آزاد، عبدالحق کوئٹہ، عبدالباقی، عبدالحق اکوڑہ خٹک مولوی حسن شاہ ولایت دیوبند کے بے تاج بادشاہ غلام غوث ہزاروی [illegible]

باوجاہت شکل باجلالت میں بمعہ اہل وعیال چیلے چمٹے نظر آئینگے۔ اور اگر کریڈٹ سرٹیفکیٹ انھیں ملیگا اگر بھٹو کے خلاف اسمبلی میں کاروائی کا کسی مؤرخ نے تذکرہ کیا تو مخالفت میں۔ یہی غلامان دیوبند کے بیت سے ایم ایم آپ کو ملینگے۔ لیکن دوسرا رخ قابل انعام واکرام ہوا تو مستحق پھر بھی خدام دیوبندی ہوں گے شیخ الحدیث اکوڑہ خٹک فرماتے ہیں کہ محترم اسپیکر صاحب میرا تعلق جمعیت علماء اسلام سے ہے ہمارے بزرگوں نے انتخاب کے موقع پر جتنی تائید بھٹو صاحب اور پیپلز پارٹی سے کی ہے اس سے اخبارات پڑہیں قومی اسمبلی میں اسلام کا معرکہ ص ۲)

یعنی اس موقع پر بھی دیوبند بزرگان کی بزرگی کے صدقے مستحق انعام ہونگے۔ مشہور مسلمان نقاد اور توحید پرست ادیب جناب ماہر القادری نے "فاران" میں خوبصورت اور لطیف پیرایہ میں فرمایا ہے۔ حضرت شیخ الحدیث اور ان کے بزرگوں کی اس شدید غلطی کو اللہ تعالیٰ انکی دوسری نیکیوں کے طفیل معاف کردے اور اگر کسی مورخ کے نوکِ قلم پر مسئلہ پی پی سے اتحاد اور اختلاف کا آیا تو بصورت اول یہی دیوبند کے چشم وچراغ مفتی بھٹو سے بغلگیر ہوتے نظر آئینگے اور بصورت ثانی بھی ضرب اختلاف کے پہلوان بھی یہی ہوں گے۔

اور اگر اس نام نہاد عوامی حکومت سے حصولِ مفاد کا مسئلہ درپیش ہوا تو ایک طرف آپکو مفتی صاحب وزارت علیا پر بھی کار سے مستفنی ملینگے۔ لہذا مستحق تعریف علماء دیوبند کی یہی سادگی ہوگی۔ کہ یہ رحمت ہے علمائے دیوبند کی دعاؤں کے صدقے۔ لیکن دوسری طرف کئی قاسمی آپ کو روٹ پرمٹ، پلاٹ ایجنسیاں لیتے بھی ملینگے کہ یہ رحمت ہے علمائے دیوبند کی دعاؤں کے صدقے۔

اور اگر مستقبل میں بھٹو کی رہائی موضوع بحث بنی اور فیصلہ بھٹو کے خلاف گیا تو بہت سے فضلائے دیوبند آپ کو حاکم کی سزا کے قائل بھی نظر آئینگے۔ لیکن اگر فیصلہ موافق ہوا اور اگر وہ رہا ہو گئے تو بھی علماء دیوبند کی کرامات کا

تقاضہ ہوگا۔ کیونکہ انھیں بھی حقوق حاصل ہیں جو بھٹو کی رہائی کا تقاضہ رکھتے ہیں اور اگر ضیاء الحق کی مارشل لا کو تاریخ نے نظریۂ ضرورت کے تحت صحیح قرار دیا تو بھی متحدہ غلامان دیوبند آپ کو ضیاء حکومت سے تعاون کرتے ملینگے۔

لیکن اگر مارشل لا درست نہ ہوا۔ اور اسکے خلاف جہاد ضروری ہوا تو بھی سب سے بڑے اور پہلے مجاہدین جمہوریت علمائے دیوبندی ہونگے کہ احترام اور ارشاد الحق تھانوی نے لاٹھیاں کھائیں۔ اور گرفتاریاں پیش کیں۔

بہرحال اس مختصر سی داستان دلخراش کے پیش نظر آپ جب بھی دیکھیں اور جس طرف بھی دیکھیں تو آپکو اس متضاد پالیسی کی کرشمہ سازیاں نظر آئینگی۔ کہ یہ بھی علمائے دیوبند کی برکات ہے۔ وہ بھی اولیاء دیوبند کی کرامت۔ یہ بھی علماء دیوبند کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ اور وہ بھی فضلائے دیوبند کی کوشش کا ثمرہ۔ یہ بھی علماء دیوبند کے علم وفضل کا کرشمہ اور وہ بھی خدام دیوبند کے ہنر وفن کا مظہر۔ غرض کہ جدھر سے تمغہ کریڈٹ اور ایوارڈ آئے تو خاندان دیوبندی کا نام ہوگا۔ خواہ وہ ذلت ورسوائی کا ہو یا عزت وشرافت کا۔ گویا کہ ع جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے

قارئین۔ شاید آپ سمجھیں کہ یہ تمام امور وواقعات حادثاتی یا اتفاقی ہیں۔ ہرگز ایسا نہیں بلکہ مبنی بر تعمد اور ایک سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ ابنائے دیوبند نے۔ ہر محاذ پر کسطرح محاذ آرائی شروع کررکھی۔ مثلاً سیاست بازی جیتنے کیلئے جمعیت علمائے اسلام۔ مرزائیت پر فتح یاب ہونے کیلئے تحفظ ختم نبوت حالانکہ کوئی وقت تھا کہ یہ تنظیم تمام مکاتیب فکر کا ایک متفقہ مسئلہ کا نشان امتیاز واتحاد تھا۔ لیکن اب دیوبندی ہی نہیں بلکہ صرف تاج محمود لیمیٹڈ کا دوسرا نام ہے۔ لیکن اس سے محصولہ نتائج بھی علمائے دیوبند کی کرامات ہی ہونگے۔ اہل تشیع کے مقابلہ میں تحفظ ناموس صحابہ کی تنظیم معرض وجود میں آئی کہ اگر کسی وقت اس سلسلے میں انعام وصول کرنیکا موقع آیا تو ہمارے منہ کا پانی خشک نہ ہوگا۔ شرک وبدعت کے خلاف اڑھائی رکنی جماعت "اشاعۃ التوحید والسنہ" ہے۔

تاکہ وقت آنے پر یہ ایوارڈ بھی ہمارے حصے میں آسکے۔ تبلیغ وارشاد کیلئے تبلیغی جماعت اور مرکز چنیوٹ کا ہتھیار استعمال ہوا۔ کہ اس میدان میں بھی کوئی موقعہ علمائے دیوبند کے ذریعہ پورے اسلام کو اپنے نام رجسٹری کروانے کا ضایع نہ ہونے پائے اہل حدیث حضرات کے خلاف نفس وجود کو ناکافی تصور کرتے ہوئے "انجمن حزب الاحناف" بنالی کہ رضاخانیوں کی ہمدردیاں حاصل کرکے اہل حدیث سے مناجرات کا کریڈٹ بھی کوئی اور نہ لیجانے پائے ــــ اور بریلویت کے خلاف محاذ آرائی کیلئے سواد اعظم کا عظیم فراڈ رچایا۔ کہ اہل حدیث کو استعمال کرکے بوقت الزام ہم حاضری دے سکیں اور بالفرض یہ تنظیمیں حصول منزل میں ناکام رہتی ہیں تو کریڈٹ لینے پھر بھی آپکو علمائے دیوبند ہی تمام سے آگے نظر آئینگے کہیں مرزا قادیانی کی حمایت ہے۔ تو دوسری طرف ہاتھ کی صفائی کا کرتب اور اہل تشیع سے بھی مصالحت ہوسکتی ہے کہ شعوری اور غیر شعوری طور پر توہین صحابہ میں یہ کوئی کم مقام تو نہیں رکھتے۔ اسی طرح عجمی مشرکین سے بھی دوستی ممکن ہے کہ مجاوران دین پور۔ خانقاہ کندیاں، تھانہ بھون اسی بیماری کا تو علاج ہیں

(ہفت روزہ افق ۲۳ اپریل تا ۲۹ اپریل ج ۲ شمارہ ۱، صفحہ ۲)

یہ ہیں علمائے دیوبند کے اضطرار اور کردار بیقرار کی چند جھلکیاں جسے اہل حدیث مضمون نگار، "برق التوحیدی" نے نہایت جارحانہ انداز میں لکھا ہے۔

اگر ہم یہاں بخاری و مسلم سے دو حدیث لکھدیں تو شاید بات بہت واضح ہوجائے

۱۔ مَثَلُ الْمُنَافِقِ ۔ منافق کی مثال۔

كَالشَّاةِ الْعَائِرَةِ بَيْنَ الْغَنَمَيْنِ تَعِيرُ إِلَى هٰذِهِ مَرَّةً وَإِلَى هٰذِهِ مَرَّةً۔

(اس بکری کیطرح ہے (جو بکرے کی تلاش میں) دو ریوڑوں کے درمیان پھرتی رہتی ہے (مسلم)

۲۔ بدترین لوگ۔

تجِدُونَ شَرَّ النَّاسِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ذَا الْوَجْهَيْنِ الَّذِي يَأْتِي هٰؤُلَاءِ بِوَجْهٍ وَهٰؤُلَاءِ بِوَجْهٍ (بخاری و مسلم)

(قیامت کے دن بدترین لوگ دو چہروں والے ہونگے (یعنی منافق) ایک چہرے سے ان کی طرف اُٹھنگے اور دوسرے چہرے سے دوسروں کی طرف)

اس باب میں جناب شورش مرحوم نے بڑے جارحانہ انداز میں کہا ہے

گاہ گنگا گاہ جمنا پر وضو کرنے لگے	ہم انھیں عالم سمجھتے تھے مگر دجّال ہیں
پیرواشد تھے کبھی انکے ولبھ بھائی پٹیل	اب بھی انکے ذہن میں پنڈت جواہر لال ہیں
قائدِاعظم کی شخصیت سے نفرت آجتک	اس پہ دعویٰ کہ اپنے دور کے ابدال ہیں
پالی پیٹے دھرم دھاری کلچر کی گنگی کیساتھ	کیسے کیسے لوگ شورش صاحبِ اقبال ہیں

(ہفت روزہ چٹان ۱۹۲۰ء)

تحریکِ خلافت

دورِ خزاں

جنگ آزادی کے دوران برصغیر کے وسیع و فراخ سینے پر جو ہولناک اور لرزہ خیز خونی کھیل کھیلا گیا۔ اسکا ذکر اتنا لرزہ خیز ہے کہ دل اور قلم دونوں تھر اُٹھتے ہیں۔ برصغیر کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی بے گور و کفن لاشیں مدتوں ظلم و ستم کی دردناک داستانیں سناتی رہیں۔ جلے ہوئے منہدم مکانات سے اٹھنے والے دھوئیں آہوں کیساتھ نہ جانے کن بلندیوں میں کھوجاتے تھے۔ اور ایک طویل مدت گذر گی کسی قابل ذکر انقلاب نے کروٹ نہیں لی

گویا پوری قوم حسرتوں اور مایوسیوں کی اتھاہ تاریکیوں میں گم ہوگئی تھی۔ یا پھر ظلمات کے بیکراں سمندر نے قوم کے جیالوں کو نگل لیا تھا ــــ قائدین یا تو شہادت کی سعادت حاصل کر چکے تھے یا کالے پانی کے جہنم کدہ میں صبر و استقامت کیساتھ صعوبتوں کے دن گذار رہے تھے ـــ اور جو باقی بچے تھے عفو و عافیت کی تلاش میں تھے۔

ان میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے عزت کے بجائے ذلت کو قبول کرلیا تھا انھیں آزادی سے زیادہ غلامی پرکشش نظر آرہی تھی۔ دنیاوی وجاہت کی چاہت میں آخرت کی سعادت بھول گئے تھے۔ خطابات و نوازشات کی چکاچوند نے عزت ملی کو

پامالی کردیا تھا۔ بہر صورت گورے حکمرانوں اور اُنکے کالے غلاموں کے لگائے ہوئے زخم بیحد کاری تھے۔ سسکیوں اور ہچکیوں کے ختم ہونے میں ایک مدت گذر گئی۔

کچھ انجمنیں کچھ کمٹیاں

اس دوران میں کئی انجمنیں اور کمٹیاں ور الیسوسی ایشنیں بنیں (۱) برہمو سماج بنگال میں (۲) پرارتھنا سماج مہاراشٹر میں (۳) آریہ سماج پنجاب میں۔ (۴) تھیاسوفیکل سوسائٹی مدراس میں۔

اسی طرح ۱۸۷۴ء میں اور اسکے قریب میں۔ مہاجن سبھا مدراس میں۔ سروجانک سبھا پونہ میں۔ انڈین الیوسی ایشن بنگال میں۔ بمبئی الیسوایشن بمبئی میں۔

اور پھر ۱۸۸۵ء میں آل انڈیا یونین بنی۔ اور اس کے سال بعد ہی ۱۸۸۶ء میں آل انڈیا کانگریس بن گئی۔ جسے ایک انگریز مسٹر ہیوم نے قائم کیا ——— اسی طرح ۱۸۹۳ء میں گنگادھر تلک نے ایک انجمن مخالفت ذبیحہ گاؤ "آرڈیفنس الیوسی ایشن" بنایا ——— اور اسی سال ۱۸۹۳ء میں جسٹس محمود نے ڈیفنس الیوسی ایشن قائم کیا ——— اور پھر اسی گنگادھر تلک نے ۱۸۹۵ء دسیواجی فیسٹیول قائم کیا۔ مگر ان میں ایک آدھ کے علاوہ تمام انجمنوں یا کمیٹیوں اور الیوسی ایشنوں کے قائم کرنیوالے کٹر ہندو تھے۔ اور ان میں سے اکثر صراحۃً مسلمانوں کے خلاف صف آرا تھے۔ ان ہندوانہ تحریکوں نے مسلمانوں کو کچل کر رکھدیا تھا۔ حالات کی ناموافقت نے انھیں پامالی کردیا۔ انھیں اتنے زخم آئے تھے کہ انکا شمار ممکن نہیں۔

ع تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

اور پھر انھیں زخموں کے دیکھتے گنتے پوری اُنیسویں صدی ختم ہوگئی۔ بالآخر بیسویں صدی کا انقلاب آخریں دور شروع ہوگیا۔

مسلم لیگ کا قیام

اگر اجازت ہو تو کہدوں کہ یہ ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا ۱۹۰۶ء میں بمقام ڈھاکہ نواب سلیم اللہ خان۔ نواب وقار الملک، اور مولانا محمد علی کی کوششوں سے مسلم لیگ قائم ہوئی مگر اُسے بھی ملک گیر حیثیت حاصل کرنے میں سالہا سال لگ گئے۔ اور پھر انھیں ایام میں ایک ایسا وقت بھی آیا کہ پورے برصغیر میں تحریکات کا ایک عظیم طوفان برپا ہوگیا۔ مجاہدین نے ایک نئی کروٹ لی حریت پسند

یک نئی شکل میں ظاہر ہوئے۔ دبی ہوئی چنگاریاں بھڑکنے لگیں اور جذبہ جنوں آگے بڑھنے کو بیقرار ہوگیا۔

تحریک خلافت اور چند دوسری تحریکیں

ان میں "تحریک خلافت" تحریک ترک موالات "تحریک ہجرت اور تحریک ترک گاؤ۔ ہندو مسلم اتحاد۔ یعنی متحدہ قومیت کا نعرۂ مستانہ۔ اور بہت سی چھوٹی بڑی تحریکوں نے جنم لیا۔ اور برصغیر کے وسیع وعریض سینے پر انمٹ نقوش چھوڑ گئیں۔

چونکہ ہم کتاب کے موضوع کے اعتبار سے صرف انھیں تحریکات کا جائزہ لے سکتے ہیں جو مسلم تحریک کہلاتی ہوں اور جن میں علمائے حق اور علمائے اہلسنت پر اعتراضات وارد کیے گئے ہوں۔ لہذا پہلے تحریک خلافت!

تحریک خلافت کے بارے میں ابتدا ہی سے ہمارا نقطہ نظر بالکل واضح اور غیر مبہم رہا ہے اور اس باب میں جو بات بے شمار شواہد کو سامنے رکھ کر قطعیت کیساتھ کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ نفس تحریک خلافت سے امام احمد رضا اور انکے رفقاء کو قطعاً کوئی اختلاف نہیں تھا۔ البتہ اس تحریک خلافت کے طریقہ کار اور اس مذہبی، ملی، دینی اور اسلامی مسئلہ میں ہندوؤں سے اخوت واستعانت اور گاندھی جیسے اسلام دشمن کی قیادت وسیادت سے سخت اختلاف رہا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں امام احمد رضا کی مخالفت کی گئی اور انھیں نہ صرف یہ کہ تحریک خلافت کا دشمن قرار دیا گیا بلکہ انگریز دوستی کا الزام بھی چسپاں کیا گیا۔ (جسے کبھی ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی گئی)۔

مگر ابھی بہت دن نہیں گذرے تھے کہ لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ حق وہی تھا جو امام احمد رضا اور انکے رفقاء نے فرمایا تھا۔ جوش وجذبات کے دھارے جیسے ہی تھمے سچائی وصداقت کا پرچم لہرا اٹھا۔ اور ہندوؤں سے مودت ورفاقت اور مشرکوں سے موافقت اور استعانت کی قلعی کھل گئی اور جھوٹی اخوت کی سیاہ نقاب تارتار ہوگئی۔ ملمع اترتے ہی اندر کا بھیانک روپ ظاہر ہوگیا۔

اور حد یہ ہے کہ یہ تحریک خلافت جنکے لئے چلائی گئی تھی اور جنکے لئے۔ بے پناہ قربانیاں دی

گی تھیں۔ اور جنکے استقلال کیلئے سینے چھلنی کروائے گئے تھے، اور جن کی بقا کیلئے ماؤں نے اپنے بچوں کو۔ بہنوں نے اپنے بھائیوں کو، بیویوں نے اپنے شوہروں کو قربان کر دیا تھا۔ ان کا انجام کچھ اچھا نہیں ہوا۔

مصطفیٰ کمال پاشا اور انکے ساتھیوں نے برسر اقتدار آتے ہی صرف خلافت ہی نہیں بے شمار شعائر اسلام کو بھی پامالی کر دیا اور سیکولر (لادینی) حکومت کا اعلان کر دیا۔ مسجدوں میں تالے پڑ گئے۔ اذانیں بند ہوگئیں۔ اور باپردہ خواتین کی نقابیں نوچ کر تذرآتش کر دیا گیا۔

تحریک خلافت کا تاریخی پس منظر

۵ جولائی ۱۹۱۹ء کو بمبئی میں خلافت کمیٹی کا قیام عمل میں آیا اور ۲۳ نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں عظیم الشان خلافت کانفرنس منعقد ہوئی۔ پروفیسر احمد سعید لکھتے ہیں کہ

> جنگ عظیم اول کے بعد ترکی کیساتھ انگریزوں نے جو سلوک کیا۔ اسکے پیش نظر مسلمانوں کیلئے اسکے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہ گیا تھا۔ کہ وہ ایک ملک گیر تحریک کا آغاز کریں۔ ادھر پنجاب میں جلیانوالہ باغ کا حادثہ پیش آگیا جس کی وجہ سے ہندو مسلم اتحاد میں مدد ملی ہندو اور مسلمان دونوں انگریزوں کے خلاف متحد ہو کر کوئی قدم اٹھانیکا فیصلہ کیا چنانچہ ہندوستانی مسلمانوں نے مجلس خلافت کے نام سے ایک جماعت کی دہلی میں ۱۹۱۹ء کو مولوی فضل حق کے زیر صدارت ایک عظیم الشان خلافت کانفرنس منعقد ہوئی مولوی فضل حق نے اپنے خطبہ صدارت میں اس بات پر زور دیا کہ خلافت کے مسئلے میں غیر مسلموں کی مدد حاصل کیجائے خلافت کانفرنس کے اختتام پر مندرجہ ذیل قراردادیں پاس کی گئیں۔
>
> نمبر۱ ایران اور ترکی کے مقدس مقامات میں جو زیادتیاں کی گئی ہیں ان پر اظہار رنج کیلئے مسلمانان ہند جشن صلح میں شریک نہ ہوں۔ اور اسکے خلاف جلسے منعقد کریں
>
> نمبر۲ مسلمان حکومت سے ترک موالات کریں
>
> نمبر۳ اگر حسب منشا ترکی کا فیصلہ نہ ہوا تو پھر ولایتی مال کا بائیکاٹ کیا جائے۔
>
> گاندھی نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور یہ اعلان کیا کہ خلافت کے مسئلہ پر وہ

مسلمانوں کا ساتھ دیا گا۔ گاندھی کی رائے میں ہندو مسلم اتحاد کا اس سے بہتر موقع سو سال میں بھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

(حصول پاکستان ص ۱۴۷ پروفیسر احمد سعید)

تحریک خلافت اور اس کا رد عمل

اس عنوان کے تحت جناب رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں

تحریک خلافت ایک ہولناک اور لرزہ خیز طوفان کیطرح ہندوستان کے سیاسی مطلع پر نمودار ہوئی تھی مسلمانوں کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ وہ سر سے کفن باندھ کر میدان جہاد میں اتر چکے تھے۔ جیل جانا ایک کھیل بن گیا تھا۔ سینے پر گولیاں کھانا روزمرہ کا واقعہ تھا ـــ اس طوفان کا رخ جس نے موڑنا چاہا اسکی پگڑی سلامت نہ رہ سکی۔ یہ مسئلہ مسلمانوں کی موت و زیست کا مسئلہ بن گیا تھا انہوں نے طے کر لیا تھا کہ جو انکے ساتھ ہے ان کا دوست ہے اور جو ان کے ساتھ نہیں ہے وہ دشمن کے سوا کچھ نہیں ہے جسے انہوں نے اپنا مخالف سمجھا (غلط یا صحیح اس کی بحث نہیں) اس کا سیاسی وجود ختم کر دیا گیا۔ محمد علی جناح کو انہوں نے گوشہ نشینی پر مجبور کر دیا..... اکابر علماء و صلحا اخیار ابرار میں سے جس نے بھی اس تحریک کی مخالفت کی اسے مسلمانوں کے قومی پلیٹ فارم سے ہٹ جانا پڑا۔ تحریک خلافت کے مخالف مسلمانوں کی لاشیں تک پڑی رہتی تھیں لیکن قبرستان میں دفن نہیں ہو پاتی تھیں۔ انکی نماز جنازہ پڑھنے والا کوئی نہیں ملتا تھا۔ مخالفین کا سماجی مقاطعہ کیا جاتا تھا۔ اور انہیں مسلم محلوں میں رہنا دوبھر ہو جاتا تھا۔

ڈاکٹر کچلو نے ہندوں کے "سنگھٹن" کے مقابلے میں مجلس تنظیم قائم کی اور مسلمانوں کی نظر سے اتر گئے۔ خواجہ حسن نظامی نے شدھی کے مقابلے میں تبلیغ کا نعرہ بلند کیا لیکن مسلمانوں نے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس سے تحریک خلافت کے کمزور ہونیکا اندیشہ تھا، ہندو اتحاد میں خلل پڑنے کا اندیشہ تھا۔ کانگریس کی مرکزیت ختم ہونیکا دھڑکا تھا

اور مسلمان آزادیٔ ہند کے نشے میں، ہندو مسلم اتحاد کے جوش میں اتنے بے خود ہو چکے تھے کہ انہوں نے واقعات سے آنکھیں بند کر لی تھیں، حقائق سے منہ موڑ لیا تھا۔ کہ کہیں ہندو مسلم اتحاد کا آبگینہ پاش پاش نہ ہو جائے

(قائد اعظم محمد علی جناح اور انکا عہد ص۵۱ رئیس احمد جعفری)

جناب رئیس احمد جعفری مرحوم کی اس حقائق پر مبنی مفصل تحریر کے بعد یہ بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت برصغیر پاک و ہند کی کیا صورت حال ہوگی۔ اور علمائے حق علمائے اہلسنت کو کن المناک واقعات سے دوچار ہونا پڑا ہوگا۔ ان گھمبیر تاریکیوں میں اور خوفناک آندھیوں میں شمع صداقت کا روشن کرنا کتنا دشوار امر تھا۔ پھر بھی امام احمد رضا اور انکے دلیر رفقاء چراغ جلاتے رہے اور پر نور کرنیں اندھیروں کے سینے روشن کرتی رہیں

حسب ذیل اشعار پڑھ کر اس دور کی دیوانگی کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے

غریب قوم کے مردہ بدن میں جان ڈالی ہے — لگا کے آپ نے ٹھوکر مہاتما گاندھی
عجب نہیں کہ یہ بیکنڈ میں کریں لبسرام — کہ جیتے رہتے ہیں ہر ہر مہاتما گاندھی
ہمیں امید ہے ہم کامیاب ہوں گے ضرور — کہ ہیں ہماری مدد پر مہاتما گاندھی

اور پھر دیکھئے کہ دل کی یہ تاریکیاں کہاں تک پہنچ جاتی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے

چل فخر قوم حضرت گاندھی کو دیکھ آئیں — جوش و خروش قوم کی آندھی کو دیکھ آئیں
اک دھوم مچ گئی ہے مسیحا وہ آ گئے — کرتے ہیں درد کا جو مداوا وہ آ گئے
تعریف کوئی کر سکے اُن کی یہ نا درست — خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست
مردہ تھی قوم آپ نے اسکو جلا دیا — ہم سب کو آب چشمۂ حیواں پلا دیا

ایک اور استقبالیہ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

ہیں جنکو دیکھ کر مہر و مہ ششدر وہ آئے ہیں — جھکاتے ہیں ملائک جنکے آگے سر وہ آئے ہیں

ماخوذ از تحریک آزادی ہند

اور غضب یہ ہے کہ یہ تمام اشعار اُن مسلمانوں نے کہے ہیں جنکی مسلمانی اس دور میں اتنی مستند

ہے کہ وہ دوسرے مسلمانوں کو کلمہ پڑھاتے پھرتے ہیں۔

غور طلب بات یہ ہے کہ اس قسم کے اشعار اور ایسے ہی عقائد و نظریات کی امام احمد رضا اور اُنکے رفقاء نے گرفت کی تو کونسی بری بات کی۔ کیا یہ سب کچھ دیکھنے اور سننے کے باوجود اُنھیں خاموش رہنا چاہیئے تھا؟ ہرگز نہیں انھوں نے گرفت کی اور بالکل صحیح گرفت کی اس پر امام احمد رضا کا مواخذہ کرنا سخت بد دیانتی ہو گی۔

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے ٭ جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا

قائد اعظم کی مایوسی

"تحریک خلافت" کے بارے میں جناب رضی حیدر لکھتے ہیں۔

> محمد علی جناح کی زندگی میں ۱۹۲۱ء ایک نہایت اہم موڑ تھا جب وہ ہندوستان کی سیاست سے کسی حد تک دل برداشتہ ہو گئے تھے اب وہ صرف ایک سیاسی جماعت کے رکن تھے اور وہ بھی مسلم لیگ جو بعد میں محمد علی جناح اور برصغیر کے مسلمانوں کی تمناؤں اور آرزوں کا محور ثابت ہوئی۔ خود ہندوں کیلئے یہ بات بڑی تجسس کا باعث تھی کہ کل تک جسکو اتحاد کا پیغامبر اور امن کا نقیب کہا جاتا تھا وہ آج اس قدر وجہ تنقید کیوں بنا گیا ہے۔ لیکن جذبات کے تیز دھارے نے غور و فکر کے لمحات عوام سے چھین لئے تھے چاروں طرف کانگرس اور خلافت کے مشترکہ موقف کی دھوم تھی
>
> مسٹر گاندھی ذہین اور نفسیات انسانی کے بہت بڑے ماہر تھے انھیں مسئلہ خلافت اور مسلمانوں کے جذبات کا احساس تھا چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کیلئے مسئلہ خلافت کو صرف مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ سارے اہل ہند کا مسئلہ قرار دیا ـــــ مولانا محمد علی جوہر بھی اپنی تمامتر ذہانت اور فراست اور علم و فضل کے باوجود بنیادی طور پر جذباتی انسان تھے اور ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہیئے کہ وہ مسٹر گاندھی کی چال کو نہ سمجھ سکے اور خلافت جیسی اسلامی تحریک کی باگ ڈور ایک کٹر ہندو کے ہاتھ میں دے بیٹھے ایسی صورت میں

محمد علی جناح کی آواز کون سنتا وہ آئین اور قانونی اور سیاسی جدوجہد کی بات کر رہے تھے جبکہ گاندھی جی نے پورے ہندوستان کو گھراؤ اور جلاؤ کی نظر کر دیا تھا۔

(قائداعظم کے بہتر سال ص۱۶۸ رضی حیدر)

یاد رہے کہ انھیں ایام میں محمد علی جناح کو بھی انگریزوں کا ایجنٹ کہا گیا تھا اور انھیں دنوں امام احمد رضا پر بھی انگریز دوستی کا الزام تراشا گیا تھا (جسکا کوئی دستاویزی ثبوت آج تک فراہم نہیں کیا گیا۔) اور غضب یہ تھا کہ عین اسی زمانہ میں ہندوں کیطرف سے مسلمانوں کے خلاف وہ سب کچھ ہو رہا تھا جو اس دوستی، یگانگت اور بھائی چارہ کے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا عجیب دوغلا پن اور دورخی تھی شدھی اور سنگٹھن کی تحریک بھی جاری تھی اور مسلمانوں سے اتحاد اور دوستی بھی۔ مسلمانوں پر قاتلانہ حملے بھی ہو رہے تھے اور امن و آشتی کا پرچار بھی۔ مسلمانوں کی بستیاں تاراج بھی کیجا رہی تھیں اور اظہار الفت و پیار بھی۔ خون آشام مہا سبھائیوں کی کھلم کھلا حمایت بھی ہو رہی تھی اور مسلمانوں سے اخوت کا اقرار بھی۔

گاندھی کا حکم

تقریبًا ہر وہ شخص جو ذرا بھی تاریخ سے لگاؤ رکھتا ہے وہ گاندھی اور انکے ہمنواؤں سے بخوبی واقف ہے۔ چنانچہ جناب رضی حیدر لکھتے ہیں

خلافت کے مسئلے پر کانگرس اور خلافت کمیٹی کا اتحاد عمل میں آچکا تھا اس سلسلے میں گاندھی جی نے مسلمانوں کو گھیرنے اور انکی ہمدردیاں حاصل کرنے کیلئے بڑی عجلت سے کام لیا، جو مکھی اڑنا گاندھی جی کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی وہ ایک تحریک کے نتائج سامنے نہیں آنے دیتے اور دوسری تحریک شروع کر دیتے جسکی بناء پر پہلی تحریک دم توڑ جاتی۔ ہندوستان واپسی کے بعد انکا مسلسل یہی دستور رہا چنانچہ انہوں نے خلافت کے مسئلے پر بھی اسی عجلت کا مظاہرہ کیا۔

۱۲ جون سنہ ۱۹۲۰ء بنارس میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس نے خلافت کمیٹی پر زور دیا کہ وہ مجلس ترک موالات کے نام سے ایک انتظامیہ مجلس بنائے اور مفصل پروگرام تیار کر کے اس پر عمل درآمد کرائے

(قائداعظم کے بہتر سال ص۱۵۲)

گاندھی جی کی قیادت اور اس کا صلہ

خلافت اور گاندھی جی کے سلسلے میں جناب رئیس احمد جعفری صاحب نے اپنی کتاب "قائد اعظم محمد علی جناح اور اُن کا عہد" میں بڑے دلچسپ اور عجیب وغریب حقائق سے پردہ اٹھایا ہے۔ جسکے دیکھنے کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کے بارے میں گاندھی جی کے کیا عزائم تھے اور اس جانثار قوم سے وہ کتنے مخلص تھے عنوان ہے "گاندھی جی کی قیادت"۔

> علی برادران نے گاندھی جی کی قیادت قبول کرلی اور انھیں باپو تک کہنے لگے لیکن گاندھی جی نے مسلمانوں کے بل پر مہاتما بننے کے بعد... مسلمانوں کیساتھ کیا کیا یہ رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم کی زبانی سنئے ۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۲۷ء پشاور کے ایک عظیم الشان اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے محمد علی نے کہا کانگرس کو انڈین نیشنل کانگرس فی الحقیقت مسلمانوں نے بنایا ہے۔ اس سے پہلے وہ عافیت پسندوں کی تفریح گاہ تھی ۔ مگر جس دن محمد علی شوکت علی اس میں شریک ہوئے اسی دن سے اس میں جان پڑ گئی چنانچہ کلکتہ کانگرس میں لالہ لاجپت رائے کی مخالفت کے باوجود کانگرس نے ترک موالات کو اپنا شعار بنایا۔
>
> اور یہ حقیقت ہمیں بہت فخر کیساتھ یاد رہیگی کہ سب سے جلیل القدر ہندو رہنما مہاتما گاندھی ہمیشہ خلافت کے سرمایہ سے دورہ کرتا رہا۔ ہماری قید کے بعد بھی مہاتما جی نے دورہ کے مصارف خلافت کے سرمایہ سے لئے حتیٰ کہ کانگرس کیلئے ایک کروڑ روپیہ جمع کرنے کیلئے آپکے دوروں کے مصارف بھی مجلس خلافت نے ادا کئے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ کانگرس کی روح رواں تحریک خلافت اور مجلس خلافت تھی۔
>
> قائد اعظم محمد علی جناح اور انکا عہد صفحہ ۱۰۱

یہ تھا گاندھی جی کی قیادت وسیادت کا مالی صلا اور خلوص ومحبت کا گرانقدر انعام جو انھوں نے مجلس خلافت سے بلا جھجک وصول کیا۔

دیوانگی کی انتہا

مجلس خلافت کے اغراض و مقاصد کی ایک شق یہ بھی تھی کہ خلافت کا تحفظ اور مقدس مقامات کی حفاظت و نگہداشت کیجائے ۔ اس سلسلے میں سواد اعظم اہلسنت وجماعت پر الزام لگایا گیا تھا کہ یہ خلافت کے دشمن ہیں اور اماکن مقدسہ کا تحفظ نہیں چاہتے ۔ جسکے جواب میں تاج العلما محمد عمر صاحب نعیمی علیہ الرحمہ نے السواد اعظم میں ایک مضمون تحریر فرمایا کہ ۔

> کسقدر تعجب کا مقام ہے کہ دین اسلام کا حامی ، شریعت کا پاسدار تو سلطنت اسلامیہ اور اماکن مقدسہ کا مخالف سمجھا جائے اور وہ وہابیہ جنکے نزدیک بقیہ دنیا مشرک ہے اور قبے بنانا جائز اور ڈھانا جائز ۔ وہ اس کے حامی اور مددگار سمجھے جاتے ہیں ۔ گرگ گلہ کی چوپانی
>
> (تحریک آزادی ہند اور السواد الاعظم صد ۱۹۹)

مقابر اور مقامات مقدسہ کی پامالی کی کہانی جناب شورش کی زبانی ہم پہلے صفحات میں سنا آئے ہیں کیا یہ عجیب بات نہیں کہ جن لوگوں کے نزدیک ازواج مطہرات بنات النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور کبار صحابۂ کرام کے مزارات و مقابر روند ڈالنا کوئی بات نہیں تھی وہ امام احمد رضا علیہ الرحمہ پر اعتراض کر رہے تھے ۔

" تحریک خلافت " اور " تحریک ترک موالات " وغیرہ کے اس ہنگامہ خیز دور میں جس کی ہلاکت آفرینی کا اندازہ گذشتہ صفحات کے مطالعہ سے آپ کو بخوبی ہوگیا ہوگا کہ حالات کتنی نازک صورت اختیار کر گئے تھے ۔ اور سرکش جذبات مذہبی ، ملی اخلاقی اور دیگر تمام حدود و قیود کو توڑ کر کہاں جا پہنچے تھے دیوانگی نے اسلام و کفر کے امتیازات مٹا ڈالے تھے

- جب کہ محبت و نفرت کی علامت گاندھی کی الفت و عداوت کو قرار دیا گیا تھا ۔
- جبکہ گاندھی کی اطاعت لازمی اور ضروری سمجھی جاتی تھی ۔
- جبکہ گاندھی کے سامنے ملائکہ کے سر جھکائے جاتے تھے ۔
- جبکہ اسلام کے کٹر دشمن ہندؤں کو ہادی و رہنما کہا جاتا تھا ۔
- جبکہ اسلام کے خلاف اُنھیں رازدار اور دخیل ٹھہرایا جارہا تھا !

- جب کہ مسلمانوں کی میت بے گور وکفن سڑتی رہتی تھی اور ہندوؤں کی ارتھی کو کاندھا دیا جا رہا تھا۔
- جبکہ مسلمان زخموں سے چور لہو میں لتھڑے تڑپتے رہتے تھے اور ہندوں کی دلجوئی کیجاتی تھی۔
- جبکہ ذوقِ اتحاد میں ہندوں کو برادران وطن کہکر سینوں سے لگایا جاتا تھا اور دینی بھائیوں کو نفرت سے دھتکار دیا جاتا تھا۔
- جبکہ اسلام دشمن ہندوں کو مسجد میں ممبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بٹھا کر وعظ سنایا جاتا تھا اور مبلغین اسلام سے منہ پھیر لیا جاتا تھا۔
- جبکہ ایک عامی مسلمان ہی نہیں بڑے بڑے مسلمان شیخ الہند قسم کے لوگ ماتھے پر قشقہ لگانا فخر سمجھتے تھے۔
- جب کہ گاندھی جی اور گئو ماتا کے ساتھ ہی محمود الحسن کی جے پکاری جاتی تھی اور اس پر خوشی کا اظہار کیا جاتا تھا۔
- جب کہ مسلمان ہندوں کی لاشوں اور انکے مردار جسم کو مرگھٹ تک پہنچانے کو اعزاز سمجھتے تھے اور مسلمان میت کا جنازہ بھی نہیں پڑھا جاتا تھا۔
- جب کہ کھدر کے علاوہ کسی اور کپڑے کا کفن ہوتا۔ تو مولانا مدنی جنازہ بھی نہیں پڑھاتے تھے
- جب کہ قرآن خوانی اور بھجن ساتھ ساتھ ہوتے تھے۔
- جب کہ قربانی کی گایوں کو پھولوں کے ہار پہنا کر باجے گاجے اور ڈھول ڈھمکے کیساتھ گئوشالہ پہنچا دیا جاتا تھا۔
- جب کہ قرآن وسنت کیطرف رہنمائی کرنیوالے علماء و مشائخ کو انگریزوں کا ایجنٹ کہا جاتا تھا اور ان کی اہانت کیجاتی تھی۔
- جب کہ مشائخ عظام کی توہین وتذلیل اور پنڈتوں کی تعظیم وتوقیر کیا جاتی تھی۔
- جب کہ کئی مولوی، مولانا۔ رہنمایان دین وملت "پنڈت جی" کہلانے پر فخر محسوس کرتے تھے
- جبکہ قائد اعظم جیسی جرأت مند شخصیت اور ہمدرد اسلام کو خاموشی اور گوشہ نشینی پر مجبور کر دیا گیا تھا۔

سیدنا امام احمد رضا

دو عالم سے بیگانہ کرتی ہے دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی

انھیں اندوہگیں او دلگیر ایام میں امام احمد رضا اور انکی اولاد واحفاد اور انکے رُفقاءِ مُتعاد بلاخوف خطران پھیلی ہوئی خونی تاریکیوں میں امنڈتے ہوئے بلاخیز طوفانوں میں پوری جرأت کیساتھ نعرۂ حق بلند کر رہے تھے۔ اسلام کے شیروں کی ڈھکاروں نے بڑے بڑے جغادری لیڈروں کو پسپا کر دیا تھا۔

مگر امام احمد رضا اور انکے رفقاء متبعین کو مشق ستم بنایا گیا اور انکے خلاف باقاعدہ فرد جرم تیار کی گئی۔

- ۱ یہ کہ یہ لوگ حمایت سلطنت اسلامیہ کے خلاف ہیں۔
- ۲ یہ کہ یہ لوگ اماکن مقدسہ کی حفاظت ضروری نہیں جانتے۔
- ۳ یہ کہ امام احمد رضا نینی تال میں لفٹیننٹ گورنر سے ملاقات کی تھی۔
- ۴ یہ کہ گورمنٹ کی خوشی کیلئے اسکے حسب منشا فتاوے دیے گئے۔
- ۵ یہ کہ گورمنٹ سے اُجرت اور تنخواہیں پاتے تھے۔
- ۶ کانپور کے حنفی سنی علماء صوبہ متحدہ کے جلسہ میں باصرار بلایا گیا مگر شرکت سے انکار کر دیا۔ یاد رہے کہ یہ وہ دور تھا جب امام احمد رضا علیہ الرحمہ شدید بیمار تھے چنانچہ ۱۹۲۱ء ہی میں آپ کا وصال ہو گیا۔ انھیں دنوں مولانا مختار احمد صاحب صدیقی علیہ الرحمہ نے مذکورہ بالا سوالات کے جوابات طلب کئے اور آپ نے سخت ناتوانی کے باوجود سلسلہ وار جوابات مرحمت فرمائے جو جمادی الاول ۱۳۲۹ھ میں شائع ہوئے۔
- ۱ سلطنت اسلامیہ اگرچہ بدعمل اور بدمذہب ہو بشرطیکہ اس کی بدمذہبی کفر تک نہ پہنچی ہو۔ جب کفار سے اسکی جنگ ہو گی مسلمانوں پر حسب استطاعت اسکی امداد فرض ہے۔ استطاعت سے زیادہ نہیں۔
- ۲ اسی طرح اماکن مقدسہ اور جملہ شعائر اسلام کی حفاظت علی حسب الوسعۃ فرض ہے۔
- ۳ ۴ ۵ اس کا جواب میرے پاس اس سے بہتر کیا ہے لَعْنَةُ اللهِ عَلَى الْكٰذِبِين

جس نے ایسا کیا ہو اس پر قیامت تک اللہ جل جلالہ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اسکے نیک بندوں کی لعنت ہو۔

● ۶۔ مولوی نثار احمد صاحب جمیعت العلماء صوبہ متحدہ کی دعوت لیکر آئے۔ میں نے اسکے مقاصد ہندوں سے اتحاد اور دیوبندیوں، وہابیوں کی شرکت وکیفیت وغیرہ بیان کئے انہوں نے کہا ہم خالص اہلسنت کا جلسہ کرینگے میں نے کہا کیجئے۔ میں خالص اہلسنت کے ایک خادم کار کی حیثیت سے اپنی تحریر بھیجدوں گا جلسہ میں پڑھی جائے کہ میں بوجہ ضعف وعلالت حاضری سے معذور ہوں۔

اس قسم کے جھوٹے الزامات کا مقصد صرف یہ تھا کہ ایک عبقری شخصیت کو عالم اسلام میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے بدنام کر دیا جائے اور امام احمد رضا کا مخالف طبقہ آج بھی اسی ڈگر پر رواں دواں ہے۔ اور تقریباً پون صدی گذر جانے کے باوجود اپنے الزامات پر ایک بھی دستاویزی ثبوت پیش نہ کرسکے۔

بخلاف اسکے آج پورا پریس اُن لوگوں کی مدح سرائی پر کمربستہ ہے جن لوگوں نے واقعتہً بداہتہً انگریزوں کی ہمنوائی کی اور خطابات سے سرفراز کئے گئے۔ سید طفیل احمد منگلوری علیگ لکھتے ہیں

> انگریزوں اور ترکوں کے درمیان ۱۸۸۲ء میں جب مصر کے بارہ میں بدمزگی ہوئی تو سرسید نے انگریزوں کی تائید کی اور انکی تحریک سے مولوی سمیع اللہ خان صاحب جو علی گڑھ کالج قائم کرنے میں اُنکے دست راست تھے حکومت کیطرف سے مصر بھیجے گئے اور انہوں نے مصری نوجوان کے خیالات انگریزوں کیطرف سے درست کرنے میں اور سیاسی امور میں لارڈ کرومر کا ہاتھ بٹانے میں نمایاں حصہ لیا جسکے صلے میں انھیں سی، ایم، جی کا خطاب ملا۔
>
> اسکے پندرہ سال بعد ۱۸۹۷ء ترکی اور یونان کی جنگ میں انگریزوں نے یونانیوں کی حمایت کی تو مسلمانانِ ہند نے عام طور پر انگریزوں سے ناراضی کا اظہار کیا اس وقت سرسید اور حاجی محمد اسماعیل صاحب رئیس علی گڑھ نے انگریزوں کی حمایت میں مضامین کا ایک سلسلہ نکالا۔

(مسلمانوں کا روشن مستقبل ص۲۸۹)

؎ شمع کیطرح جلیں بزم گہ عالم میں خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

بندے ماترم یہ مسلمانوں کیلئے ایک دل آزار نغمہ ہے، اسے کانگریس نے اپنا قومی ترانہ قرار دیا تھا۔ بہت عرصہ پہلے ایک انتہائی متعصب ہندو ادیب نے ایک ناول لکھا تھا "آنند متھو" (خوشیوں کا مندر) اس کا مرکزی کردار یہ تھا کہ یہ ڈاکوؤں اور لٹیروں کا ایک گروہ تھا۔ جو مسلمان حکمرانوں کے خلاف لوٹ مار اور دہشت انگیزی کرتا تھا۔ گویا زیر زمین ایک دہشت انگیز تنظیم تھی جو مسلمانوں کے خلاف سرگرم عمل تھی۔ جنکا ترانہ (یا نغمہ) بندے ماترم تھا۔ وہ سب ڈاکو ملکر اپنی دھرتی ماتا کو گویا سلام کرتے تھے۔ حصول آزادی کے بعد بھی کانگرس کا یہی قومی ترانہ باقی رہا اور اسی نغمہ سے ہر تقریب کی ابتدا ہوتی تھی۔ مگر جب کچھ مسلمان ممبران نے واک آؤٹ شروع کر دیا تو یہ نغمہ بند کر دیا گیا اسکے باوجود دیگر سرکاری تقریبوں کا افتتاح اسی سے ہوتا۔

• تعلیمی اداروں میں بھی یہی صورت حال تھی گاندھی کی تصویر کو سامنے رکھ کر پوجا کا انداز اختیار کیا جاتا اور بندے ماترم کا نغمہ گایا جاتا۔

سچ یہ ہے کہ جب کسی قوم کی ملی غیرت رو بزوال ہو تو اس سے ایسے ہی افعال سرزد ہوتے ہیں جیسا کہ "تحریک خلافت" اور متحدہ قومیت کے دور میں ہوا۔

قومی تشخص کی پامالی اس باب میں ہم بہت سی باتیں پہلے لکھ آئے ہیں اور اب یہی کہانی پروفیسر احمد سعید صاحب کی زبانی سنئے۔

احمد سعید صاحب اپنی کتاب "حصول پاکستان" میں "تحریک خلافت کے برکات" گنواتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں

> تحریک خلافت کی بدولت علماء اپنے حجروں سے نکل کر میدان سیاست میں آئے اور اس موقع پر انہوں نے اعلانیہ طور پر حصہ لیا اگرچہ اسکا نقصان بھی ہوا کہ نیم علماء نے بعض ایسی حرکات کیں جن سے اسلامی تصورات کو سخت نقصان پہنچا۔ ان میں سے بعض نے گاندھی کو مثل نبی قرار دیا اور اسکے ہر قول کو قرآن و حدیث پر منطبق کرنے کی کوشش کی۔
>
> (حصول پاکستان صفحہ ۱۴۱)

کیا اسلامی تشخص کی پامالی اور ملی بے غیرتی کی اس سے بڑی مثال بھی مل سکتی ہے ۔ ہر مسلمان اس سے یہ صحیح اندازہ لگا سکتا ہے کہ صرف مسلمان ہی نہیں اپنے آپکو عالم دین کہلانیوالے بھی اس نارو اغلو میں کہاں تک جا پہنچے تھے ۔

ویسے پروفیسر احمد سعید صاحب نے نیم علماء لکھ کر اس کی اہمیت کو کم کرنیکی کوشش فرمائی ہے جس سے انکی اپنی تحقیقات مجروح ہوتی ہے ۔ جناب پروفیسر صاحب نیم علماء لکھ دینے سے ان دردناک واقعات کی سنگینی ختم نہیں ہو سکتی ۔

جنھیں محترم پروفیسر صاحب نے نیم علماء فرمایا ہے ۔ ان میں سے کوئی بھی استاذ الاساتذہ ، مفتی زمان ۔ شیخ الحدیث والقرآن ۔ شیخ العرب والعجم ، اور شیخ الہند سے کم نہیں تھا ۔ مولوی عبدالباری صاحب فرنگی محلی کے متعلق آپ کیا فرمائیں گے ۔ مولانا محمود الحسن شیخ الہند کے متعلق آپ کا کیا ارشاد ہوگا ۔ کیا یہ لوگ جو تلک اور قشقہ لگا کر اپنے جیکارے سنتے اور جھومتے تھے نیم علماء تھے ۔ مولانا حسین احمد مدنی ، مفتی کفایت اللہ ، ابوالکلام آزاد کو آپ ناخواندہ کہیں گے ؟

یہ لوگ تو بڑے اہل علم اور ہنرمند لوگ تھے مگر بات صرف اتنی تھی کہ

وترکھم فی ظلمت لا یبصرون

؎ پائے ماندن ہمیں حاصل ہے نہ یارائے رفتن جس طرف دیکھیئے شامت ہے خدا خیر کرے

اور پھر یہ مسئلہ خلافت جس بھیانک انجام کو پہنچا اُس کا ذکر آگے آ رہا ہے ۔

وائے قومے گشتہ تدبیر غیر
کار او تخریب خود تعمیر غیر

تحریک ترک موالات اور ہندو مسلم اتحاد

احوال و واقعات

واقعہ یہ ہے کہ "تحریک خلافت" نے اپنے مختصر دور میں جن خطرناک چیزوں کو جنم دیا اُن میں "تحریک ترک موالات"، "تحریک ہجرت اور تحریک ہندو مسلم اتحاد جیسی خطرناک چیزیں بھی تھیں۔

تحریک کیا تھی ایک بھیانک سیاہ طوفان تھا جس میں ہزاروں زلزلے اور لاکھوں بجلیاں ہرا رہی تھیں۔ اپنے پرائے کا امتیاز ختم ہو چکا تھا۔ صداقت کی حیات آفریں روشنی دھندلا کر رہ گئی تھی۔ طوفانوں کا رخ موڑ دینے والے جرأت مند لوگ کانگرس اور گاندھی کے دام فریب میں تھے حالانکہ بنفسہ کانگرس خود کچھ نہیں تھی۔ یہ انگریزوں کے اشارے پر وجود میں آئی تھی اور انھیں کے گن گاتی تھی۔ یہ شب و روز حکمران طبقہ کے چشم ابرو کے اشارے کی منتظر رہا کرتی تھی۔ اور اس باب میں مسٹر گاندھی کی سیاست حکمران طبقہ سے ساز کرنے کے علاوہ کچھ نہیں تھی۔ اچھوت رہنما ڈاکٹر امبیدکر نے اسی دور میں کہا تھا "کانگرس کو حقیقۃً عظیم اور طاقتور بنانیوالے ہندو نہیں بلکہ مسلمان تھے اور جناب مولانا محمد علی جوہر نے بھی پشاور کے عظیم الشان اجلاس میں یہی کہا تھا کہ ہم سے پہلے کانگرس عافیت پسندوں کی ایک جماعت تھی۔ مسلمانوں کے گرم لہو نے اس میں جان ڈالی۔

جیسا کہ ہم اس سے پہلے لکھ آئے ہیں کہ بنارس کے اجلاس میں گاندھی جی نے مسلمان لیڈروں کو ہدایت کی تھی وہ فی الفور ترک موالات شروع کر دیں۔ چنانچہ

> ۶ دسمبر ۱۹۲۰ء کو جمعیت علماء ہند کا ایک غیر معمولی اجلاس منعقد ہوا اس میں مولانا ابو الکلام آزاد نے ایک قرار داد پیش کی جس میں کہا گیا کہ چونکہ برطانیہ نے اپنے وعدوں کی کھلی خلاف ورزی کی ہے۔ اور خلافت کے اقتدار کو زائل کرنے اور خلیفۃ المسلمین کی مذہبی طاقت کی بیخ کنی کرنے میں اسلام کیساتھ صریح طور پہ مذہبی تعصب کا ثبوت دیا ہے اس لئے مسلمانوں پر لازم آگیا ہے کہ وہ ان اعدائے اسلام سے ترک موالات کریں اسکے بعد باقاعدہ طور پر ترک موالات کا فتویٰ شائع ہوا جسمیں

پانچ سو علماء کے دستخط تھے۔

(حصول پاکستان ص ۱۲۷)

اس ضمن میں جناب پروفیسر احمد سعید صاحب لکھتے ہیں۔

تحریک خلافت کو مؤثر بنانے کیلئے ترک موالات کا نسخہ ایجاد کیا گیا علماء نے باقاعدہ فتوے جاری کئے جن میں مندرجہ امور پر گورنمنٹ سے عدم تعاون کیلئے کہا گیا۔
۱۔ حکومت کے انتظامی اور قانون کونسلوں سے عدم تعلق کا اعلان ۲۔ عدالتوں کا بائیکاٹ ۳۔ ایسے اسکولوں اور کالجوں کا بائیکاٹ جنکو سرکاری امداد ملتی ہو ۴۔ آزیری مجسٹریٹی اور اعزازی عہدے کا ترک کرنا ۵۔ گورنمنٹ کے عطا کردہ خطابات کا واپس کرنا ۶۔ گورنمنٹ کی ملازمتوں کو ترک کرنا۔
چنانچہ ہزاروں لوگوں نے اپنے خطابات واپس کر دئیے۔ حکومت کی امداد سے چلنے والے اسکولوں اور کالجوں سے اپنے بچوں کو اٹھا لیا گیا۔ ایسے نوجوان جو آگے چل کر حکومت کے بڑے بڑے عہدے پر فائز ہو سکتے تھے حکومت کی نوکری پر لات مار کر معمولی ملازمتوں کو ترجیح دی ـــــ طلبا نے تعلیم کو خیرباد کہدیا اور قومی تحریک میں کام کرنے لگے صرف کلکتہ میں تین ہزار طلباء نے اپنے کالج چھوڑے۔ مسلمان اپنی نوکریوں کو چھوڑ کر فاقے کرنے پر مجبور ہوئے لیکن یہ بات نہایت قابل ذکر ہے کہ ترک موالات اور عدم تعاون کی تحریک جو ہندو مسلم دونوں نے شروع کی تھی۔ یہاں بھی ہندوؤں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہ اٹھا رکھی ـــــ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا اس بات کا فیصلہ کیا گیا تھا کہ حکومت کی امداد سے چلنے والے اداروں کا یا تو بائیکاٹ کیا جائے یا ان اداروں کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ سرکاری گرانٹ لینا مسترد کر دیں۔ چنانچہ مسلم زعماء نے علی گڑھ کالج کے منتظمین سے کہا کہ وہ سرکاری گرانٹ بند کر دیں ـــــ لیکن منتظمین کالج نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا بلکہ اس تحریک کی مذمت کی۔ جسکے نتیجے میں مولانا محمد علی جوہر اور کالج کے کرتا دھرتا حضرات میں سخت کشمکش کا آغاز ہوا۔ بالآخر مولانا محمد علی اور ان کے ساتھیوں

نے علی گڑھ کے بائیکاٹ کرنے اور جامعہ ملیہ قائم کرنیکا فیصلہ کیا۔ ایک تو علی گڑھ کالج میں اضطرابی کیفیت جاری تھی۔

اُدھر بنارس یونیورسٹی میں بالکل سکون تھا جب بنارس یونیورسٹی سے بھی اس قسم کا مطالبہ کیا گیا تو مدن موہن مالویہ نے نہ صرف مولانا محمد علی جوہر بلکہ گاندھی جی کو بھی تقریر کرنیکی اجازت نہیں دی۔ گاندھی جی نے صرف یہ کہا کر "مالویہ جی نہیں مانتے" ہندو یونیورسٹی کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچنے دیا۔

(حصول پاکستان ص۱۲۹ تا ص۱۴۱م)

ان حالات وواقعات کے پیش نظر یہاں صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ ۔۔۔ ایک وہ ہیں جنھیں تصویر بنا آتی ہے

حقائق وشواہد

اگر بات یہیں تک رہتی تو بھی غنیمت تھی مگر یہاں "جمعیت العلماء ہند" نے جو پاکستان میں مشرف باسلام ہوکر "جمعیت العلماء اسلام بن گی ہے اور اب مارشل لاء کی وجہ سے "نظام اسلام" کہلاتی ہے۔ شاید یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ دین وملت شرم وغیرت سب کچھ گاندھی کے چرنوں میں ڈال کر دم لیگی۔

پروفیسر احمد سعید لکھتے ہیں۔

ہندوستان کی تمام تاریخ میں یہ دور پہلا اور آخری دور تھا جس میں ہندو مسلم اتحاد اپنے عروج پر تھا مگر اس زمانہ نے بہت کم عمر پائی۔ مسلمانوں نے ہندوں کی دلجوئی حاصل کرنیکی بہت کوشش کی مسلمان رضاکاروں نے رام لیلا کا بندوبست کیا، مندروں میں دعائیں مانگی گئیں، وید کو الہامی کتاب تسلیم کیا گیا، رامائن کی پوجا میں شرکت کی گئی۔ مسلمانوں نے اپنے ماتھوں پر تلک لگائے۔ گنگا پر پھول اور بتاشے چڑھائے گئے۔

بار بار اس بات کا اعلان کیا جاتا کہ "گاندھی مستحق نبوت تھا" اور کہا گیا کہ اگر نبوت ختم نہ ہوتی تو گاندھی نبی ہوتا۔ گائے کی قربانی کو موقوف کرنیکی تجاویز پیش کی گئیں۔ اور سب سے زیادہ غضب یہ کیا کر دہلی کی جامع مسجد میں

ممبرِ رسول پر ایک متعصب ہندو شردھانند سے تقریر کروائی۔ اس شردھانند نے بعد میں مسلمانوں کو ہندو بنانے کی تحریک شدھی کا آغاز کیا۔ ان تمام باتوں کے باوجود ہندو ذہن میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔

(حصول پاکستان ص۱۴۱)

کیا یہ وہی تاریخی حقائق نہیں جسے امام احمد رضا اور انکے رفقاء نے بیان کیا تھا جسکی وجہ سے متحدہ قومیت کے پروانے برافروختہ نظر آتے تھے بلکہ اب تک ان نیک روحوں کو معاف نہیں کیا۔

ہم پوچھتے ہیں کہ وہ کون لوگ تھے جنھوں نے متحدہ قومیت کا نعرہ لگایا۔ اور وہ کون لوگ تھے جنھوں نے مشرکین سے بھائی چارہ کیا۔ اُن کا خمیر کہاں سے اُٹھا تھا اور آج انکی ذریات کیا سوچ رہی ہے۔

جناب رضی حیدر لکھتے ہیں۔

۲۲ جون کو مسٹر گاندھی اور خلافت کمیٹی کے راہنماؤں نے ایک منشور جاری کیا جس میں اعلان کیا گیا کہ اگر پہلی اگست ۱۹۲۰ء تک پلیش کردہ مشترکہ شرائط تسلیم نہ کی گئیں تو ترکِ موالات شروع کر دیا جائیگا چنانچہ ۔ ۷ جولائی ۱۹۲۰ء گاندھی جی نے خلافت کانفرنس کی مجلس عدم تعاون کیطرف سے ترکِ موالات کے پہلے مرحلے کا اعلان کر دیا۔

(قائد اعظم کے بہتر سال رضی حیدر)

پھر اس کے ساتھ ہی جناب شیخ الہند محمود الحسن صاحب کا فتویٰ جاری ہو گیا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ جناب گاندھی گنگنائیں اور علمائے دیوبند کی چھانچھ نہ بجے۔ سُر میں سُر ملانا ضروری تھا سودہ مل گئی۔ جناب محمد حسین مدنی فرماتے ہیں

تحریک خلافت کا زور تھا، انگریزوں کی غداری سے لوگوں میں سخت برہمی تھی۔ ترکِ موالات کا زور تھا اس لئے چاہتے تھے کہ علی گڑھ یونیورسٹی برطانیہ سے ترکِ تعلق کرے مگر پرانے سرکار پرست ٹرسٹیان یونیورسٹی کب اسے

گوارا کر سکتے تھے۔ انہوں نے سخت مخالفت کی جسکے نتیجے ہیں۔ مولانا محمد علی مرحوم اور انکے ہم خیال لوگوں کیساتھ یونیورسٹی کی ایک بڑی اور معتدبہ جماعت یونیورسٹی سے جدا ہوگئی۔ اور آزاد درسگاہ قائم کرنے کیلئے جس میں کوئی مداخلت حکومت برطانیہ کی نہ ہو۔

تیاری کرنے لگی یہ وہ زمانہ ہے جبکہ ناگپور میں اجلاس کانگرس ہوا تھا اور اسمیں نان کوآپریشن کی تحریک پاس ہوچکی تھی اسکے خلاف مسٹر جناح اور اُن کے موافقین کی رائے بہت کمزور پڑگئی تھی۔ اور یہ پارٹی حد درجہ اقلیت میں آگئی تھی ملک کے تمام اہل الرائے ہندو اور مسلمان برطانیہ سے نہایت برگشتہ ہورہے تھے۔ مہاتما گاندھی کی رائے قبولیت عامہ حاصل کرچکی تھی۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ترک موالات کے متعلق طلبائے یونیورسٹی نے فتویٰ حاصل کرلیا تھا جس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ترک موالات کی تمام دفعات میں کانگرس کی موافقت کی تھی۔ اور تمام مسلمان اور طلبا یونیورسٹی کو زوردار مشورہ تھا کہ وہ اس پر عمل کریں۔

گورنمنٹ سے قطع تعلق کریں اور تمام کالج اور اسکول گورنمنٹی امداد چھوڑدیں اور کالجوں اور اسکولوں کے زعمار ایڈ نہ چھوڑیں تو طلبا ایسے کالجوں اور اسکولوں سے نکل آئیں۔ نیز ملازمان حکومت انگریزی ان ملازمتوں سے علیحدہ ہوجائیں جن میں حکومت کی امداد خالص طور پر ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ .... اس فتویٰ سے گورنمنٹ نے سر رحیم بخش صاحب کو خصوصی طور پر دوسری مرتبہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو سمجھانے اور فتویٰ کو واپس لینے کیلئے بھیجا تھا۔ مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس فتویٰ ترک موالات پر اصرار کیا اور واپس نہیں لیا۔

جیسا کہ طلبا مسلم یونیورسٹی کے پاس ترک موالات کا مفصل فتویٰ بھیجا گیا تھا اس طرف خلافت کمیٹی کے کارکنوں نے بھی فتویٰ حاصل کیا اور وہ چھپ کر شائع ہوا

(نقش حیات ص ۶۴۳)

اس باب میں جناب رضی حیدر لکھتے ہیں۔

> ہندوستان میں تحریک خلافت کافی زور پکڑ گئی تھی اور اس میں شیخ مولانا محمود الحسن، مولانا عبدالباری فرنگی محل اور مولانا اشرف علی تھانوی جیسے علماء نہ صرف شامل ہو گئے تھے۔ بلکہ ترک موالات، ذبیحہ گاؤ۔ اور ہجرت کے موقع پر فتویٰ بھی حاصل کر لئے گئے تھے۔ محمد علی جناح کا اس سلسلے میں موقف بڑا واضح تھا۔ اور وہ اس تحریک سے بالکل علیحدہ تھے۔
>
> (قائداعظم کے بہتر سال ص ۱۵۵)

ہلاکت خیز تحریک

جناب رئیس احمد جعفری نے اپنی کتاب "قائداعظم محمد علی جناح اور اُنکا عہد" میں یہی عنوان قائم کیا ہے اور فرماتے ہیں اپنی تقریر میں جناب جناح نے اس تحریک کو "ہلاکت خیز تحریک" قرار دیا تھا۔ ہندؤں کیلئے تو یہ تحریک یقیناً ہلاکت خیز نہیں تھی

لیکن مسلمانوں کو اس سے ہلاکت تباہی اور بربادی اور ادبار کے سوا کچھ نہ ملا

> ہندؤں کی بنارس یونیورسٹی برابر قائم رہی ایک دن کیلئے بھی وہاں سلسلہ تعلیم بند نہ ہوا اور مسلم یونیورسٹی لب گور ہوگئی۔ پھر ہجرت کی تحریک اُٹھی تو اٹھارہ ہزار مسلمان اپنا گھر بار، جائداد اور اسباب غیر منقولہ اونے پونے بیچ کر (اسکے خریدنے والے زیادہ تر ہندو ہی تھے) افغانستان ہجرت کر گئے۔
>
> وہاں جگہ نہ ملی واپس کئے گئے۔ جو واپس آئے تباہ حال خستہ و درماندہ، مفلس قلاش تہیدست۔ بینوا بے یار و مددگار۔ اگر اسے ہلاکت خیز نہیں کہتے تو کیا کہتے ہیں۔ اگر جناح نے اُسے ہلاکت خیز قرار دیا تھا تو کیا غلط کہا تھا۔
>
> (قائداعظم محمد علی جناح اور انکا عہد ص ۱۰۳)

محمد علی جناح اور محمد علی جوہر کی جھڑپ

حقیقت یہ ہے کہ اتنا پر آشوب اور جذباتی دور تھا کہ تحریک خلافت وغیرہ کے باب میں ایک لفظ بھی سننا گوارہ نہیں کیا جاتا تھا۔ جناب رضی حیدر قائداعظم کے بہتر سال میں

چوہدری خلیق الزمان کی کتاب شاہراہِ پاکستان کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔

> اس اجلاس میں مولانا محمد علی جوہر اور محمد علی جناح کے درمیان جھڑپ ہوئی اور مولانا محمد علی جوہر نے آپ کے خلاف تقریر کی۔ محمد علی جناح اسی دن شام کی گاڑی سے مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کئے بغیر بمبئی چلے گئے۔ بعد میں مسلم لیگ کا تیرہواں سالانہ اجلاس ڈاکٹر مختار احمد کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں ترک موالات کی قرارداد منظور کر لی گی۔ کیونکہ کانگرس کے اجلاس کی کامیابی کے بعد مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے اس قرارداد کی مخالفت ناممکن ہو گئی تھی۔
>
> (قائداعظم کے بہتر سال ص ۱۹۶)

جھڑپ کی مزید تفصیلات

یہ واقعہ دسمبر ۱۹۲۰ء کے آخری عشرہ کا ہے۔ جب ناگپور میں مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کے بیک وقت اجلاس ہو رہے تھے اور بہت بڑی تعداد میں لوگوں کی حاضری تھی اور یہ اختلاف ایک دستوری اور آئینی اختلاف کی بنا پر ہوا۔ اس اجلاس میں گاندھی جی نے جو قرارداد پیش کی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ، انڈین نیشنل کانگرس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی عوام۔ تمام جائز اور پر امن ذرائع سے سوراج حاصل کریں جبکہ اس سے پہلے کانگرس کیلئے یہ طے شدہ بات تھی کہ دستوری، آئینی طریقوں سے قومی اتحاد کے ذریعہ نظم و نسق میں اصلاح کرنا تھا۔ قائداعظم نے فرمایا کہ میں اس قرارداد کی مخالفت کرتا ہوں۔

اور ابھی یہ پہلا ہی جملہ ادا کیا تھا کہ گاندھی اور خلافت کے شیدائیوں نے طوفان برپا کر دیا اور بدمزگی اپنی انتہا کو پہنچ گی انھیں ایام میں قائداعظم نے کانگرس سے استعفیٰ دیدیا۔ (بطور احتجاج) ایک با اصول انسان کو وہی کچھ کرنا چاہئے تھا جو انہوں نے کیا۔ جیسا کہ رئیس حیدر لکھتے ہیں

> ایک با اصول قانون دان کی حیثیت سے وہ اُن قراردادوں کو گوارہ نہیں کر سکتے تھے جو کانگرس نے اس اجلاس میں منظور کی تھیں۔ وہ ہندوستان کے موقف کے سلسلے میں کسی احتجاج یا سخت اقدامات کے مخالف نہیں تھے۔ لیکن وہ

اس پروگرام پر یقین نہیں رکھتے تھے جسے کانگرس نے منظور کیا تھا۔
اس اجلاس میں اُنھوں نے مجمع کی جانب سے سخت مخالفت برداشت کی لیکن اُنھوں نے واضح الفاظ میں گاندھی سے کہا کہ تمہارا راستہ غلط ہے اور میرا راستہ صحیح ہے۔ کیونکہ آئینی اور قانونی طریقہ کار ہمیشہ درست ہوتا ہے۔
محمد علی جناح اس بات کو سمجھنے سے قاصر تھے کہ ایسی تحریک کسطرح کامیاب ہو سکتی ہے۔ جس میں لڑکوں کو اسکول اور کالجوں سے اُٹھا کر اور اُن کا تعلیم سے ناطہ توڑ کر مظاہروں اور ہنگاموں کی راہ پر لگا دیا جائے۔ مگر راستی اور نیک نیتی پر مبنی جناح کی بات نہیں سنی گئی۔ عوام اس بات پر تیار نہیں تھے کہ وہ کوئی سنجیدہ بات سنیں۔

(قائد اعظم کے بہتر سال ص۱۱۶)

اس کی کچھ تفصیل جناب رئیس احمد جعفری صاحب نے بھی بیان کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ

گوکھلے کی برسی کے موقع پر قائد اعظم سے ان امور کے متعلق سوال کیے گئے تھے جس کے جواب میں آپ نے تقریر فرمائی اور ۱۲ فروری سنہ ۱۹۲۱ء کے بمبئی کرانیکل میں شائع ہوئی۔ میرے بہت سے دوستوں اور رفیقوں نے پوچھا ہے کہ سیاست کے اس نازک ترین دور میں خاموش کیوں ہو۔ یا الگ تھلگ کیوں ہو بلاشبہ موجودہ صورت حال دشواریوں اور خطروں سے لبریز ہے۔
ایک طرف حکومت کا وہ خود سرانہ اور سفاکانہ طرز عمل ہے۔ جس نے وقارِ قومی کو مجروح کر رکھا ہے۔ جس شخص میں ذرا بھی فہم سیاسی ہوگی وہ حکومت کو اس طرز عمل پر ملامت کئے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن دوسری طرف یہ کہنے سے بھی باز نہیں رہ سکتا کہ گاندھی جی نے جنکی میں عزت کرتا ہوں۔ جو پروگرام اختیار کیا ہے وہ قوم کو غلط راستے پر لئے جا رہا ہے۔
آوازیں۔ نہیں نہیں! ۔ جناح میں جانتا ہوں آپ یہی کہیں گے لیکن میں آپ سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ اگر یہ پروگرام قوم کو غلط راستے پر نہ لئے جا رہا ہوتا۔

اور اگر مجھے یقین ہوتا کہ یہ صحیح پروگرام ہے تو میں پہلا شخص ہوتا جو اسکی عمل تائید کرتا میں گاندھی جی اور اُنکے رفقار کی عزت کرتا ہوں اور اُنکے جذبۂ قربانی کا معترف ہوں لیکن میں پھر یہ کہوں گا کہ اُنکا پروگرام قوم کو صراط مستقیم کے بجائے ایک گڑھے کیطرف لیجا رہا ہے۔

آوازیں نہیں نہیں!

اب گاندھی جی کے پروگرام کی دوسری شق لیجئے یہ ہے اسکول کا مقاطعہ میں پوچھتا ہوں آخر ترک تعلیم کا مقصد کیا ہے۔ کیا صرف چرخہ کاتنا۔ اگر یہی بات ہے اور گاندھی جی کہتے ہیں یہی بات ہے تو میں کہوں گا کہ یہ تحریک سیاسی تحریک بہر حال نہیں ہے۔ گاندھی جی کے پروگرام کی تیسری شق ہے کھدر کا عام رواج۔ اس پر خود کانگرس کے ڈیلی گیٹ بھی عامل نہیں ہیں۔

اس طرح کامیابی نہیں ہوسکتی یہ سیاسی پروگرام نہیں ہے۔ جذباتی پروگرام ہے

(قائد اعظم محمد علی جناح اور انکار عہد صفحہ ۹۶ تا ۹۹)

مولانا مدنی کا غلو

یہاں ایک اور بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ مولانا حسین احمد صاحب مدنی کھدر پوشی یا پھر گاندھی کی اتباع میں اتنا غلو فرماتے تھے کہ حیرت ہوتی ہے۔

جناب پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب لکھتے ہیں کہ

سندھ کے فاضل جلیل مولانا ہاشم جان مجددی رحمۃ اللہ علیہ راقم سے فرماتے تھے کہ مولوی حسین احمد مدنی سندھ آئے اور یہاں بھرے مجمعوں میں صافے (عمامے پگڑی) اُتروا کر کھدر کی ٹوپیاں پہنوائیں۔

تحریک آزادی ہند اور السواد الاعظم صفحہ ۱۲۴

فرمایئے کہ اگر وہ مدنی ہوتے تو مدینہ والے کی سنت عمامہ کو اُتروا کر گاندھی کیپ وہ بھی کھدر کی نہ پہنواتے کھدر پوشی کے غلو کے متعلق ایک اور بات بھی سنتے چلیں۔ تحریک نظام مصطفیٰ کے دوران خاکسار کو بھی بہت سے لوگوں کیا ساتھ جیل جانا پڑا

تھا وہاں ایک مولوی صاحب سے خاصی گپ شپ رہتی تھی۔ مولوی صاحب جماعت اسلامی کے ضلعی خزانچی تھے اور رینبدہ جمعیت علمائے پاکستان ضلع بہاولنگر کا صدر دوران گفتگو وہ مولوی حسین احمد صاحب مدنی کی روئداد سنانے لگے۔ جس میں یہ بھی فرمایا کہ مدنی صاحب ہمارے ہاں تشریف لائے رات کو سونے کیلئے جب تیار ہوئے تو تکیہ اٹھا کر پھینک دیا کہ اس کا غلاف بدیسی کپڑے کا تھا۔ اور اپنا کھدر کا کرتہ اتار کر سرہانے رکھ لیا۔ سبحان اللہ کیا سادگی و بے نیازی تھی۔ میں نے عرض کیا مولانا یہ کھدر پوشی، کس کی اتباع میں تھی۔ مدینہ والے کی یا گاندھی جی کی تو وہ منہ پھیر کر لیٹ گئے۔ اور میں سوچتا رہا۔

؎ اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا — لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

کھدر پوشی کی ایک اور کہانی

حیرت ہوتی ہے کہ ان علمائے کرام کو کیا ہو گیا تھا۔ گاندھی کی اتباع میں اتنے زبردست غلو کا کسی عام مسلمان سے بھی تصور نہیں کیا جا سکتا چہ جائیکہ "شیخ العرب والعجم" کہلانے والے مولانا مدنی سے اتنا غلو۔ التصورات کی دنیا میں تہلکہ برپا ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

> حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ لباس کے معاملہ میں سخت گاڑھا کھدر پہننے میں بہت متشدد تھے اور ہمیشہ ساری عمر کھدر پہنا اور اسکے علاوہ اور بھی اشیاء دیسی استعمال کرتے تھے اور ملنے جلنے والوں سے بھی یہی پسند کرتے تھے کہ وہ دیسی کپڑا پہنیں اور دیسی اشیاء استعمال کریں۔۔۔۔ دیسی لباس کے بارے میں اتنا اہتمام تھا کہ اگر کسی میت کو لٹھے وغیرہ کا کفن دیا جاتا تو اسکا جنازہ پڑھ تو لیتے مگر پڑھاتے نہیں تھے۔
>
> (بیس بڑے مسلمان ص۴۹۲)

اب کیا عرض کیا جائے "چھوٹا منہ بڑی بات" ہو جائے گی اور معاملہ بھی "شیخ العرب والعجم" کا ہے ورنہ دریافت کیا جا سکتا ہے کہ وہ کاریں اور گاڑیاں کیا دیوبند یا واردھا میں تیار ہوتی تھیں جن پر پورے انڈیا کا دورہ ہوتا تھا۔ ہم تو اس وقت قائل ہوتے جب مولانا بیل گاڑی پر سوار ہوتے۔ اور گاندھی جی ہانکتے ہوتے۔

رہی بات لٹھے کی تو خود ہندوستان میں عمدہ لٹھا تیار ہوتا تھا۔ وہ شاید ولایتی صرف اس لئے ہوگیا تھا کہ مشینیں غیر ملکی تھیں اور غور فرمایئے کہ مشینیں غیر ملک سے آنے کے بعد ہندوستانی نہ بن سکیں غیر ملکی ہی رہیں تو ٹانڈہ کے مولانا صاحب کچھ وقت مدینہ منورہ میں گذارنے کے بعد مدنی کس طرح ہو گئے۔؟ لیے تو ٹانڈوی ہی ہی!

الحاصل قائدِاعظم کو گاندھی کی قیادت وسیادت اور سیاست ورفاقت پر قطعاً اعتبار نہیں رہا تھا۔ وہ تخریب نہیں تعمیر کے خواہاں تھے وہ اس قسم کی تحریکات کو قوم وملت کیلئے ہلاکت خیز اور تباہ کن تصور فرماتے تھے۔

علامہ اقبال اور ترکِ موالات

گذشتہ صفحات میں یہ واضح کیا جاچکا ہے کہ قائدِاعظم محمد علی جناح نہ تو گاندھی کی قیادت پر اعتماد فرماتے تھے نہ ہی اُن کی سیاست پر اور نہ ہی وہ ان جذباتی تحریکوں پر یقین رکھتے تھے جو گاندھی اور اُنکے چلائے ہوئے تھے۔

حضرت علامہ اقبال کو ان معاملات میں سخت گھیراؤ کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ انکے معاملہ میں کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ وہ ترکِ موالات کے حامی تھے مگر حالات وواقعات اس بات کی نفی کرتے ہیں ہم یہاں جناب پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب کا قابلِ قدر تجزیہ پیش کرتے ہیں جس حقیقت بالکل واضح ہوجاتی ہے۔ آپ لکھتے ہیں

> علامہ اقبال بھی ترکِ موالات کے خلاف تھے۔ تحریک کے زمانہ میں وہ انجمن حمایت اسلام کے (لاہور) کے جنرل سکریٹری تھے ترکِ موالات کے مسئلے پر جنرل کونسل کی یہ رائے تھی کہ کوئی قطعی فیصلہ کرنے سے پہلے علماء کی رائے معلوم کیجائے علامہ اقبال اسکے موید تھے غالباً انھیں کے ایماء پر مولوی حاکم علی (پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور) نے مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی علیہ الرحمہ سے ایک فتویٰ حاصل کیا۔ اور جنرل کونسل کے ایک اجلاس میں پیش کیا۔ اس فتویٰ کی روشنی میں جنرل کونسل نے ترکِ موالات کے خلاف فیصلہ صادر کیا۔ اس پر ایک طوفان برپا ہوا۔

۲۱ نومبر سنہ ۱۹۲۰ء میں انجمن حمایت اسلام کے اجلاس میں علی برادران اور مولانا آزاد نے ترک موالات کی حمایت میں تقریر کی جب کہ علامہ کے دوست صدر انجمن سر شیخ عبدالقادر نے اسکے خلاف تقریر کی۔ علامہ نے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے رپورٹ پیش کی اور یہ محتاط اظہار خیال فرمایا

میں ہمیشہ ہر معاملے کو مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں اور جب تک کسی امر میں پورا پورا غور و غوض نہیں کر لیتا قطعی رائے قائم نہیں کرتا۔ میں مسلمانوں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر وہ آج شریعت کے احکام پر نہ چلے تو ہندوستان میں اُنکی حیثیت اسلامی نقطۂ نظر سے بالکل تباہ ہو جائیگی۔

(تحریر آزادی ہند اور السواد الاعظم ص ۱۱۹)

گاندھی جی کی دُرگت

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ اس دور میں حالات اتنے سنگین تھے کہ علامہ اقبال خاموش تھے اور قائد اعظم جیسی عظیم و باوقار شخصیت جنکی فہم و فراست جنکی ذکاوت و ذہانت اور جن کی حق گوئی و جراُت کے معترف ہندوستان انگریز پارسی سبھی تھے۔ مگر ترک موالات کے سلسلے میں اُن کی بات سننے کے روا دار نہیں تھے۔ ان نا مساعد اور دل شکن حالات میں امام احمد رضا علیہ الرحمہ اور انکے رفقاء کے شیرانہ گرج سے برصغیر کا چپہ چپہ بھر رہا تھا اور انکی انکی شرعی و سیاسی بصیرت و بصارت نے طغیانی و سرکش کے اس عالم میں تہلکہ مچا دیا تھا۔

ترک موالات اور امام احمد رضا کے سلسلے میں اگرچہ اس دور میں کچھ کام ہوا ہے خصوصًا پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب نے مختلف مقامات فاضلانہ انداز میں ان مسائل پر روشنی ڈالی ہے اور دورِ جدید کے بہکے ہوئے ذہن کو دعوتِ فکر و نظر دی ہے۔ پھر بھی بے شمار ایسی باتیں ہیں جو کہی جا سکتی ہیں اور بہت سے ایسے راستے ہیں جو منزل پہنچا سکتے ہیں اور بہت سے ایسے موضوعات ہیں جن پر لکھا جا سکتا ہے۔ پھر بھی تشنگی قائم رہے گی۔

حاصل یہ کہ اس سموم اور زہریلے دور میں جو ملی خدمات امام احمد رضا اور اُنکے رفقائے کار نے انجام دی ہیں اور جس پامردی و استقلال سے اُنہوں نے گاندھی کی او[...]ھی سیاست اور اسکے

ہمنواؤں کی اندھی رفاقت کا مقابلہ کیا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔
حق یہ ہے کہ یہ صاف ستھرے لوگ تھے اور صاف ستھری سیاست پر یقین رکھتے تھے تملق، چاپلوسی ذاتی منفعت۔ دنیا داروں کی دنیاوی وجاہت اور غلط کاروں کی کثرت انھیں حق گوئی سے نہیں روک سکتی تھی انہوں نے جو کہا قرآن وسنت کی روشنی میں کہا اور برملا کہا۔ بھیڑیوں کی غراہٹیں اور اژدہوں کی پھنکاریں انھیں صراط مستقیم سے نہ ہٹا سکیں۔
جناب رضی حیدر لکھتے ہیں۔

> بہار میں مولانا محمد علی مونگیری کی شخصیت بڑی پر اثر تھی اور آپ نے وہاں ترک موالات کے سلسلے میں مخالفت کا بڑا طوفان اٹھا رکھا تھا۔ تحریک خلافت کا ایک وفد جس میں علی برادران، گاندھی جی حکیم اجمل خاں اور دیگر رہنما شامل تھے مولانا سے ملاقات کیلئے مونگیر پہنچا۔
> وفد کے ہمراہ گاندھی جی بھی مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے آنحضرت اور قرآن کریم سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ـــــ مولانا مونگیری گاندھی جی کی ان باتوں کو خاموشی سے سنتے رہے۔ اور جب گاندھی جی اپنی بات مکمل کر چکے تو مولانا نے فرمایا کہ مجھے آپ اسلام کی وہ بات بتایئے جو آپ کو پسند نہیں آئی اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے اُس کمزور پہلو سے آگاہ کیجئے جسے آپ نے اچھا نہیں سمجھا ـــــ گاندھی جی اس سوال کیلئے تیار نہیں تھے کچھ چونکے اور فوراً بولے۔ ایسا کوئی پہلو میری نظر میں نہیں آیا ـــــ اس پر مولانا نے سوال کیا۔ تو پھر آپ نے ابھی تک اسلام قبول کیوں نہیں کیا۔ گاندھی جی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ مولانا خفا ہو گئے اور فرمایا کہ آپ نے جو کچھ کہا غلط ہے آپ ہمیں صرف پھانسنا چاہتے ہیں، صیاد بھی پرندوں کو پکڑنے کیلئے انھیں کی بولیاں بولا کرتا ہے۔
> قائد اعظم کے بہتر سال ص ۱۵۷ مہر منیر ص ۲۷۲

مشائخ عظام، علمائے کرام

بے اعتنائی کے اس دور میں خال خال ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے صداقت کا راستہ اختیار کیا اور حتی الامکان

جانبداری سے پہلو تہی کی۔ پورے عالم اسلام میں عموماً اور برصغیر میں خصوصاً مشائخ عظام اور علمائے کرام کے کارنامے و کردار سپید درخشندہ و تابندہ ہیں۔ تاریخ کا ہر دور انکی بہترین کارکردگی سے تابناک نظر آتا ہے مگر اسے بدقسمتی کے علاوہ اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ انھیں ہمیشہ صفحات تاریخ سے نکال باہر کیا گیا۔ اور انکے درخشندہ کردار سے چشم پوشی کی گئی

جناب رضی حیدر ان مورخین میں سے ایک ہیں جنھوں نے حق گوئی کیطرف توجہ فرمائی آپ لکھتے ہیں۔

> برصغیر میں علمار کا ایک طبقہ ایسا بھی تھا۔ جو اس مصلحت آمیز ماحول میں تفسیر قرآن از قرآن کے اصول پر گامزن تھا اس لئے ہندوں سے اس قدر میل جول کو اور تعاون کی سخت مخالفت کی۔ پنجاب میں سید مہر علی شاہ صاحب گولڑہ شریف متحدہ صوبجات میں اعلحضرت احمد رضا خاں بریلوی اور بہار میں مولانا محمد علی مونگیری نے اس سلسلے میں کھل کر آواز بلند کی۔
>
> پیر سید مہر علی شاہ صاحب گولڑہ شریف۔ ترکی سلطنت کو اسلامی خلافت کا درجہ نہیں دیتے تھے لیکن ان کی مکمل ہمدردی اسوقت تک ترکوں کیساتھ رہی جبتک مصطفیٰ پاشاہ کی انقلاب پسند جماعت نے برسر اقتدار آکر اس بات کا اعلان نہ کر دیا کہ "ہماری حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہے"!
>
> پیر صاحب نے جنگ طرابس اور جنگ بلقان میں گھر کے زیورات اور اصطبل کے گھوڑے تک فروخت کر کے ترکوں کی امداد کیلئے چندہ دیا۔ حتیٰ کہ تحریک خلافت کے دنوں میں بھی آپنے اُن مخلصین کو جو اس میں عملی طور سے حصہ لے رہے تھے منع فرمایا۔ لیکن جب استفسار کیا گیا کہ مسلمانوں کیلئے گاندھی کے احکامات کے تحت چلنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ تو آپ نے اسے ناجائز قرار دیا۔ آپنے ہندو سے موالات کے جواز سے انکار فرمایا۔ اور کہا کہ ترک موالات ہندو انگریز یہود سب سے ہونا چاہئے۔ کھدر کے استعمال کو تسلیم نہیں کیا۔ اور ذبیحہ گاؤ کی قباحت کو رد کیا
>
> (قائداعظم کے بہتر سال ص ۱۵۵)

زر یاؤں کے دِل جس دہل جائیں وہ طوفان

اس باب میں کچھ لکھنے سے پہلے یہ عرض کرتا چلوں "ترک موالات"

"تحریک ہجرت" "ہندو مسلم اتحاد" "ترک ذبیحہ گاؤ" کے سلسلے میں امام احمد رضا علیہ الرحمۃ کی کتاب "المحجۃ المؤتمنۃ" کا بغور مطالعہ انتہائی ضروری ہے۔ جواب رسائل رضویہ جلد دوم میں مکمل آ چکی ہے۔

امام احمد رضا علیہ الرحمۃ اور تحریک ترک موالات کے متعلق جناب رضی حیدر فرماتے ہیں۔

> فاضل بریلوی اعلیٰحضرت احمد رضا خاں سے ترک موالات کے سلسلے میں لاہور اور لائیلپور سے یکے بادیگرے دو استفتاء کئے گئے جنکا آپ نے مکمل جواب دیا۔ اس کو ایک رسالہ کی شکل میں جو اسّی صفحات پر مشتمل ہے مطبع حسنی پریس بریلی نے سنہ ۱۹۲۰ء میں شائع کیا۔ اس جواب میں جو فتویٰ کی صورت میں ہے فاضل بریلوی نے ترک موالات کے مذہبی تاریخی اور سیاسی پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے بعد اُن اقتصادی نقصانات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ جو ترکِ موالات کے نتیجہ میں مسلمانوں کو پہنچنے کا اندیشہ تھا۔
>
> آپ نے فرمایا کہ ہنود اس لئے مسلمانوں کو ترک موالات پر اکسا رہے ہیں تاکہ مسلمان تمام چیزوں سے محروم ہو جائیں۔ اور ہر حصہ اور محکمہ میں صرف ہنود باقی رہ جائیں۔ ترک موالات میں فاضل بریلوی کی تحریک پر ہندو مسلم اتحاد کے خلاف تقاریر و مضامین کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔
>
> اس ضمن میں سب سے پیش پیش مولانا وصی احمد محدث صورتی کے خلف الرشید اور ممتاز عالم دین مولانا عبدالاحد پیلی بھیتی تھے۔ آپ نے پورے ہندوستان کا دورہ کر کے ترک موالات کی شرعی حیثیت اور اس کے نقصانات سے مسلمانوں کو آگاہ کیا۔ اور مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اس سلسلے میں قرآنی احکامات کی پابندی کریں ــــ
>
> (قائد اعظم کے بہتر سال ص ۱۵۶)

سلسلۂ "تحریک ترک موالات" میں پہلا خط جناب مولوی حاکم علی صاحب بی اے پروفیسر سائنس اسلامیہ کالج لاہور کا موصول ہوا القاب و آداب کے بعد لکھتے ہیں۔

پشت ہذا پر فتویٰ مطالعہ گرامی کیلئے ارسال کر کے التجا کرتا ہوں کہ دوسری نقل کی پشت پر اسکی تصحیح فرما کر احقر نیاز مند کے نام بوالپسی ڈاک اگر ممکن ہو سکے یا کم از کم دوسرے روز بھیج دیویں انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کا اجلاس بروز اتوار بتاریخ ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۰ء منعقد ہونا ہے اس میں یہ پیش کرنا ہے کہ دیوبندیوں اور نیچریوں نے مسلمانوں کو تباہ کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا ہے۔

ہندؤں اور گاندھی کیساتھ موالات قائم کرلی ہے اور مسلمانوں کے کاموں میں روڑھا اٹکانے کی ٹھان لی ہے للہ عالم حنفیہ کو ان کے ہاتھوں سے بچائیں اور عنداللہ ماجور ہوں۔

نیاز مند دعاگو حاکم علی بی اے موتی بازار لاہور

(۲۵ اکتوبر ۱۹۲۰ء)

اور اب وہ فتویٰ بھی ملاحظہ فرمالیں جو مولوی حاکم علی بی اے حنفی، نقشبندی، مجددی پروفیسر سائنس اسلامیہ کالج لاہور نے تحریر فرمایا تھا۔ لکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں کافروں اور یہود و نصاریٰ کیساتھ تولیٰ سے منع فرمایا ہے مگر ابوالکلام زبردستی تولیٰ کے معنی معاملت اور ترک موالات کو ترک معاملت (نان کواپریشن) قرار دیتے ہیں اور یہ صریح زبردستی ہے جو اللہ کے کلام پاک کیساتھ کیجا رہی ہے مذکور نے ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۰ء کی جنرل کونسل میں تشریف لاکر اطلاق یہ کر دیا جب تک اسلامیہ کالج لاہور کی سرکاری امداد بند نہ کیا جائے اور یونیورسٹی سے اس کا قطع الحاق نہ کیا جاوے تب تک انگریزوں سے ترک موالات نہیں ہو سکتی۔

اور اسلامیہ کالج کے لڑکوں کو فتویٰ دیدیا کہ اگر ایسا نہ ہو تو کالج چھوڑ دو۔ لہذا اس طرح سے کالج میں بیچینی پھیلا دی کہ پھر پڑھائی کا سخت نقصان شروع

ہو گیا ۔ علامہ مذکور کا یہ فتویٰ غلط ہے یونیورسٹی کیساتھ الحاق قائم رہنے سے اور امداد لینے سے معاملت قائم رہتی ہے ۔ نہ کہ موالات جس کے معنی محبت کے ہیں نہ کہ کام کے جو کہ معاملت کے معنی ہیں ۔

مذکور کی اس زبردستی سے اسلامیہ کالج تباہ ہو رہے ہیں مولوی محمود الحسن صاحب مولوی عبدالحی صاحب تو دیوبندی خیالات کے ہیں ۔ زبردستی فتویٰ اپنے مدعا کے مطابق دیتے ہیں لہٰذا میں یہ فتویٰ دیتا ہوں کہ یونیورسٹی کیساتھ الحاق اور امداد لینا جائز ہے ۔ میرے فتویٰ کی تصحیح اُن اصحاب سے جو دیوبندی نہیں مثلاً موید ملت طاہرہ حضرت مولانا مولوی شاہ احمد رضا خاں قادری صاحب بریلوی علاقہ روہیلکھنڈ اور مولوی اشرف علی صاحب تھانوی

(رسائل رضویہ ص۸۱)

یہاں یہ عرض کر دوں کہ مولوی حاکم علی کو یہ علم نہیں تھا کہ مولانا اشرف صاحب بھی دیوبندی مسلک سے متعلق ہیں اور علم رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں نہایت دل آزار خیالات کا اظہار فرما چکے ہیں ۔ جب اُنھیں اس کا علم ہوا تو بہت پچھتائے ۔

بہرصورت امام احمد رضا علیہ الرحمہ نے قرآن و سنت اور فقہائے امت کے ارشادات کی روشنی میں مفصل جواب مرحمت فرمایا جو مولانا حاکم علی کو وقت سے پہلے مل گیا یہی وجہ تھی کہ علامہ اقبال اور انجمن حمایت اسلام کے اراکین نے خود ساختہ ترک موالات کی تائید نہیں فرمائی ۔

امام احمد رضا علیہ الرحمہ فرماتے ہیں

رہ الحاق و اخذ و امداد اگر نہ کسی امر خلاف اسلام و مخالف شریعت سے مشروط، نہ اس کی طرف منجر تو اس کے جواز میں کلام نہیں ـــــ ورنہ ضرور ناجائز و حرام ہوگا مگر یہ عدم جواز اس شرط یا لازم سبب سے ہوگا نہ بربنائے تحریم مطلق معاملت ۔ جس کے لئے شرع میں اصلاً اصل نہیں اور خود ان مانعین کے طرز عمل اُنکے کذب دعویٰ پر شاہد ۔ ریل تار، ڈاک سے کیا معاملت نہیں!

فرق یہ ہے کہ اخذ امداد میں مال لینا ہے اور ان کے استعمال میں دینا۔ عجب کہ مقاطعت میں مال دینا حلال ہو۔ اور لینا حرام ــــ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے ریل، تار، ڈاک ہمارے ہی ملک میں ہمارے ہی روپے سے بنتے ہیں سبحان اللہ امداد تعلیم کا روپیہ کیا انگلستان سے آتا ہے؟ وہ بھی یہیں کا ہے تو حاصل یہ ٹھہرا کہ مقاطعت میں اپنے مال سے نفع پہنچانا مشروع اور خود نفع لینا ممنوع اس الٹی عقل کا کیا علاج!

مگر اس قوم سے کیا شکایت جس نے نہ صرف شریعت بلکہ نفس اسلام کو پلٹ دیا۔ مشرکین سے وداد بلکہ اتحاد بلکہ غلامی اور انقیاد فرض کیا۔ خوشنودی ہنود کیلئے اشعار اسلام بند۔ اور شعار کفر کا ہاتھوں پر علم بلند۔ مشرکین کی جے پکارنا۔ ان کی حمد کے نعرے مارنا۔ انھیں اپنی اس حاجت دینی میں جسے نہ صرف فرض بلکہ مدار ایمان ٹھہراتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس میں شریک نہ ہونیوالوں پر حکم کفر لگاتے ہیں اپنا امام وہادی بنانا ــ مساجد میں مشرک کو لیجاکر مسلمانوں سے اونچا کرکے واعظ مسلمین ٹھہرانا ــ مشرکین کی ٹکٹی کندھوں پر اٹھاکر مرگھٹ پر لیا جانا ــ مساجد کو اس کا ماتم گاہ بنانا۔ اسکے لئے دعائے مغفرت اور جنازہ کے اشتہار لگانا وغیرہ وغیرہ ناگفتہ بہ افعال موجب کفر مورث ضلال۔

یہاں تک کہ صاف لکھدیا کہ ''اگر اپنے ہندو بھائیوں کو راضی کر لو تو اپنے خدا کو راضی کر لو گے'' صاف لکھدیا کہ ہم ایسا مذہب بنانے کی فکر میں ہیں جو ہندو مسلم کا امتیاز اٹھادیگا اور سنگم وپریاگ کو مقدس علامت ٹھہرائے گا الخ

(رسائل رضویہ ص ۸۵تا۸۶)

کیا متحدہ قومیت اور برادران وطن کا یہ وہی نظریہ نہیں جسے شاہنشاہ اکبر رائج کرنا چاہتا تھا۔ وہ بھی ایک نئے دین کا موجد بن رہا تھا۔ اس نے بھی ہندوانہ رسم ورواج کو فروغ دیا تھا وہ بھی شعائر اسلام کو مٹا دینا چاہتا تھا اس نے بھی ہندوں کی محبت میں گاؤکشی کو ممنوع قرار دیا تھا۔ مگر اسی کے پوتے عالمگیر اورنگ زیب نے ان تمام باطل نظریات کی دھجیاں بکھیر دیں۔

بہر صورت وقت کا قلم حق وصداقت اور دین وملت سے عشق ومحبت کو اپنے جلو میں لئے آگے بڑھتا ہے جسکی بے پناہ روانی کے سامنے محرفین قرآن وسنت بے بس ہیں دلائل و براہین حقائق وشواہد کا امنڈتا ہوا سیلاب ہر خس وخاشاک کو بہائے لئے جا رہا ہے اس کی چمک دمک، اس کی کڑک گرج سے اعدائے اسلام تھرا رہے ہیں اس کی بے پناہ ضو فشانیاں تاریکیوں کا سینہ چھلنی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں، اس کے ایک ایک حرف ایک ایک لفظ کی حرارت ٹھٹھری ہوئی انسانیت کیلئے، قومی وملی تشخص کیلئے، مذہب وملت کیلئے سورج کی جاں نواز کرنوں کیطرح حیات آفریں ہے۔

ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کار سپاہ

اس میں قطعاً کوئی شبہ نہیں کہ امام احمد رضا اس پر آشوب دور میں وہ واحد شخصیت جس نے باطل کے ہر یلغار کا دنداں شکن جواب دیا بالآخر انھیں تسلیم کرنا پڑا کہ

> مولوی احمد رضا خاں صاحب اپنے اس فن کے کامل استاد اور بڑے ماہر تھے ندوہ والوں کے پاس اگرچہ اصحاب علم وقلم کی فوج تھی اس بریلوی خاں صاحب کے تکفیری اشتہاروں اور رسالوں کی نہ تھمنے والی بارش کو دیکھ کر انھیں بالآخر یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ خیریت اسی میں ہے کہ ان باتوں کا کوئی نوٹس نہ لو۔
>
> (بریلوی فتنہ کا نیا روپ ص۱۱)

مولوی محمد عارف سنبھلی کو یہ کون بتائے کہ ان کی مذکورہ عبارت سے کتنی بے لبسی ٹپک رہی ہے اسے دوسرے لفظوں میں "شکست خوردہ ذہنیت کا نیا روپ" کہا جا سکتا ہے انکی فوج بھی ایک سپاہی کے سامنے بے لبس نظر آتی ہے۔ امام احمد رضا علیہ الرحمہ کی گرفت شرعی اصول پر مبنی تھی جسے ان علمائے کرام کا پورا لشکر بھی نہیں توڑ سکتا تھا۔ ترک موالات کے بارے میں امام احمد رضا فرماتے ہیں۔

> کہ لیڈر امداد چھوڑتے ہیں (اور خود) مخرب دین تعلیموں پر قائم ہیں انگریزوں کی تقلید اور فیشن وغیرہ سے آزادی اور دہریت والے دینی سے نجات بہت دل خوش کن الفاظ ہیں۔ خدا ایسا ہی کرے

مگر یہ صرف ترک امداد اور الحاق (وغیرہ) سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ اس آگ کو بجھانے سے مینگے — جو سید احمد خاں نے لگائی ہے جسکی لپٹیں لیڈروں میں اب تک موجود ہیں..... جب تک فرنگی نظام تعلیم کو بدل کر (مذہب آشنا نہ کیا جائے) دہریت و نیچریت کی بیخ کنی ناممکن ہے۔
کیا لیڈر اس بات کی کوشش کر رہے ہیں؟ ہرگز نہیں!
صرف امداد و الحاق ترک کرا تے ہیں۔ جو ظاہری تعلق ہیں۔ اور تعلیمات کے گہرے تعلقات نہ چھڑاتے ہیں نہ چھوڑینگے۔
(ملخصاً رسائل رضویہ ص ۹۳)

آپ بھی غور فرمائیں کہ لوگ آج نظام تعلیم کی تبدیلی کے متعلق بڑے گھمبیر انداز میں سوچ رہے ہیں اور ماضی کے نظام تعلیم کو غلط، بیکار اور عبث قرار دے رہے ہیں۔ دین و مذہب۔ اخلاق و مروت سے دوری کے اسباب میں نظام تعلیم ہی کو دخیل فرمایا جا رہا ہے۔ اسکے لئے باقاعدہ۔ مذاکرات ہوتے ہیں۔ سیمنار قائم کئے جاتے ہیں اور طلبار کی یونینیں مطالبہ کرتی ہیں کہ موجودہ نظام تعلیم ملک و ملت کیلئے ناسور ہے، سرطان ہے
مگر امام احمد رضا علیہ الرحمہ نے ۱۹۲۰ء سے اس ضرورت کو محسوس فرمالیا تھا۔ اور بلاخوف تردید اس کا اعلان بھی فرما دیا تھا۔

آپ نے گم ہر طرف دھواں ہی دھواں
دل سے برسی سید احمد خاں (جوش)

امام احمد رضا فرماتے ہیں کہ لیڈر نصاریٰ کی ادھوری غلامی چھوڑتے اور مشرکین کی پوری غلامی مناتے ہیں۔ (کیا یہ وہی لوگ نہیں جنھوں نے ماضی میں قولاً اور عملاً انگریزوں کی حمایت کی تھی مگر اب شاکی ہیں! اور اب چھوڑنا چاہتے ہیں مبارک ہو اور خدا سچ کرے اور راست لائے مگر انصاف کیجئے۔

وہ غلامی جو سر سید نے اختیار کی ادھوری تھی (اس لئے کہ) سید احمد خاں نے کسی پادری یا نصرانی کو امور دین میں صراحۃً اپنا امام و پیشوا نہ لکھا تھا

آیات واحادیث کی تمام عمر کو چرچ یا صلیب پر نثار کرنا نہ کہا تھا۔ کسی پادری کو مساجد میں مسلمانوں کا واعظ وہادی نہ بنایا تھا۔
نصرانیت کی رضا کو خدا کی رضا یا کسی پادری کو نبی بالقوہ نہ بنایا تھا۔ اور اب مشرکین کی پوری غلامی ہو رہی ہے ۔ اُن کے ساتھ یہ سب کچھ اور اُن سے بہت زیادہ کیا جا رہا ہے یہ کونسا دین ہے (کہ) نصاریٰ کی ادھوری (امداد) سے اجتناب اور مشرکین کی پوری میں غرقاب (ملخصاً)
(رسائل رضویہ ص۹۴)

دید و شنید

ظاہر ہے کہ امام احمد رضا علیہ الرحمہ کے دلائل کے سامنے عارف سنبھلی اور اُن کے لگے بے بس تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تحریک قیام پاکستان کے دوران یہ اعتراض کیا جاتا تھا کہ محمد علی جناح کوٹ پتلون پہنتے ہیں، انگریزی بولتے ہیں انگریزوں کیساتھ اُٹھتے بیٹھتے ہیں۔ لہٰذا ان کا ساتھ نہیں دینا چاہیے۔

جمعہ کا دن تھا اور حضرت مولانا غلام یزدانی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جو حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کے شاگرد تھے تقریر فرما رہے تھے اور اُن کا بیان یہ تھا کہ ہمیں بہر صورت قیام پاکستان کی حمایت کرنی چاہیے۔ لوگ محمد علی جناح پر اعتراضات کرتے ہیں۔ اگر وہ صحیح بھی ہوں تو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ محمد علی جناح مسلمانان ہند کے وکیل ہیں (امیر المومنین) نہیں ہیں۔ اُنہوں نے ایک اچھے کام کا اقدام کیا ہے۔ دنیا میں ایک اسلامی سلطنت کے قیام کی جدوجہد کر رہے جہاں لا الٰہ کا پیغام گونجے گا۔

کسی نے دوران تقریر ہی میں پوچھ لیا کہ حضرت، ہمیں اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ آپ نے برجستہ فرمایا کہ اسلام کا فائدہ ہمارا فائدہ ہے۔ چاہے وہ کہیں بھی کسی خطہ میں کیوں نہ ہو۔

کیا یہ کم فائدہ ہے کہ ہمارے کئی کروڑ مسلمان بھائی آزاد حکومت میں اسلام کے پرچم کے نیچے امن وسکون کا سانس لے سکیں گے۔ اگر ہماری قربانیوں سے ہمارے مسلمان بھائیوں کو فائدہ پہنچے تو اس سے اچھی بات کیا ہوسکتی ہے۔ ہمیں بہر صورت ہر قسم کی قربانی کیلئے تیار رہنا چاہیے۔

پھر آپ نے فرمایا کہ یہ لوگ محمد علی جناح کا ساتھ دینے پر اس لیے معترض ہیں کہ محمد علی جناح سچے پکے باشرع مسلمان نہیں ۔ میں کہتا ہوں پھر گاندھی، نہرو، ولبھ بھائی پٹیل کا ساتھ کیوں دیا جارہا ہے کیا یہ سچے پکے خدا پرست مسلمان ہیں ۔ کیا انہوں نے بت پرستی سے توبہ کرلی ہے کیا انہوں نے دھوتی، چوٹی کو خیرباد کہدیا ہے کیا انہوں نے وید، گیتا کو چھوڑ کر قرآن خوانی شروع کردی ہے اور کسی شیخ الہند اور شیخ الحدیث کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے ہیں ۔ قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق مشرک بت پرست بہر صورت مسلمانوں کے دشمن ہیں اور عیسائی مسلمانوں کے قریب ہیں ۔

انھیں دنوں ایک واقعہ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ مولانا مدنی تقریر فرمانے آئے ۔ دوران تقریر محمد علی جناح کی سخت توہین کی اور تقریباً وہی اعتراضات کئے کہ محمد علی جناح پکے مسلمان نہیں ۔ انھیں کلمہ تک نہیں آتا ۔ تو کسی نے پوچھ لیا حضور کیا نہرو اور گاندھی جی پکے مسلمان ہیں اور انھیں کلمہ آتا ہے ۔ ابھی مولانا جواب ہی سوچ رہے تھے کہ سنگ باری شروع ہوگئی اور پورا جلسہ درہم برہم ہوگیا ۔ اور وہ برادران وطن (ہنود) جو اس جلسہ کے انتظام میں بڑے پرجوش اور پیش پیش تھے مولانا مدنی کو بغیر خبر لئے فرار ہو گئے ۔

موالات ہر کافر سے حرام ہے

امام احمد رضا علیہ الرحمہ فرماتے ہیں موالات ہر کافر ومشرک سے حرام ہے اگرچہ ذمی مطیع اسلام ہو۔ اگرچہ اپنا باپ، یا بیٹا، یا بھائی یا قریب ہو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔

تو نہ پائے گا ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں اللہ اور قیامت پر کہ دوستی کریں اللہ و رسول کے مخالفوں سے اگرچہ انکے باپ یا بیٹے یا بھائی یا کنبے والے ہوں (قرآن کریم)

سورہ   آیت نمبر

حالانکہ یہ موالات حقیقیہ نہیں تھی اسکے باوجود مسلمانوں کو تنبیہ فرمائی گئی جیسا کہ بخاری و مسلم میں اس آیت کریمہ کے بارے میں مذکور ہے کہ

"اس آیت کریمہ میں مسلمانوں کو سخت جھڑکی ہے اس بات پر کہ کافروں سے وہ بات

کریں جو بظاہر محبت ہو اگرچہ حقیقت میں دوستی نہ ہو۔" (بخاری و مسلم)

معاملت کا جواز

امام احمد رضا علیہ الرحمہ فرماتے ہیں "معاملت مجردہ سوائے مرتدین کے ہر کافر سے جائز ہے؟ جب کہ اس میں نہ کوئی اعانت کفر یا معصیت ہو۔ نہ اضرار اسلام و شریعت کا نقصان ہو (ورنہ ایسی معاملت جس میں اعانت کفر و معصیت اور اسلام و شریعت کا نقصان ہو) مسلم سے بھی حرام ہے چہ جائیکہ کافر۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔

نہ آغاز بہتر، نہ انجام اچھا

امام احمد رضا علیہ الرحمہ فرماتے ہیں۔

اور تعلیم کیلئے گورنمنٹ سے امداد قبول کرنا جو نہ مخالفت شرع سے مشروط نہ اس کی طرف منجر ہو یہ تو نفع بے غائلہ ہے۔ جس کی تحریم پر شرع مطہر سے اصلاً کوئی دلیل نہیں۔ دین پر قائم رہو زیادت نہ کرو۔ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے سلاطین کفار کے ہدایا قبول نہ فرمائے (میں اُن اسلامیہ اسکولوں اور کالجوں کی بات کر رہا ہوں جن میں کفریات کی تعلیم نہیں ہوتی) — یہ ہے وہ اسکول اور کالج جن میں خلاف شرع تعلیم دی جاتی ہے تو ان میں ویسے بھی تعلیم و تعلم حرام ہے — اور یہ حضرات جو آج (تحریک ترک موالات میں پُرجوش نظر آتے ہیں) انھیں بڑی بڑی ڈگریاں کہاں سے حاصل ہوئی ہیں۔ کیا اس وقت خباثتیں نہیں تھیں۔ اب ہوئی ہیں؟

اور جب آنکھ کھلی تو صرف ایک گوشہ انگریزوں کیطرف۔ اور وہ بھی شریعت پر زیادت کیساتھ کہ اُن سے مجرد معاملت بھی حرام قطعی بلکہ کفر اور مشرکوں کی طرف کی پہلے سے بھی زیادہ پٹ ہو گئی کہ اُن سے وداد و اتحاد واجب بلکہ انکی غلامی اور انقیاد فرض۔ انھیں راضی کر لیا تو خدا کو راضی کر لیا تو ثابت ہوا کہ اسلام ان حضرات کو نہ جب مدنظر تھا۔ نہ اب مدنظر ہے۔ ورنہ مشرکوں کے اتحاد و انقیاد کے فتنے نہ جاگتے۔ ع نہ آغاز بہتر نہ انجام بہتر۔ ملخصاً

(رسائل رضویہ ص ۹۰)

موالات ومعاملات

اس باب میں گفتگو کرتے ہوئے مجھے بار بار جناب عامر عثمانی کا وہ تجزیہ یاد آتا ہے جو انہوں نے اپنے اساتذہ کرام (علمائے دیوبند) کے عادات واطوار اور انکی ہٹ دھرمی وضد کے بارے میں کہا تھا کہ

"اپنی کسی غلطی کو تسلیم کرنا تو ہمارے آج کے بزرگان دیوبند نے سیکھا ہی نہیں! انہوں نے صرف یہ سیکھا ہے کہ اپنی کہے جاؤ اور کسی کی مت سنو۔۔۔ ماہنامہ تجلی ۱۹۶۲ء

حق یہ ہے کہ دوسرے مسائل کیطرح اس باب میں بھی یہ علمائے کرام۔ بشمول ابوالکلام۔ صراط مستقیم سے بھٹک گئے اور انتباہ کے باوجود اب تک ہٹ دھرمی قائم ہے۔ اس باب امام احمد رضا فرماتے ہیں۔

ترک معاملت کو ترک موالات بنا کر قرآن عظیم کی آیتیں کہ ترک موالات میں ہیں سوجھیں مگر فتوائے مسٹر گاندھی سے ان سب میں استثنائے مشرکین کی بیخ لگائی۔ کہ آیتیں اگرچہ عام ہیں مگر ہندوؤں کے بارے میں نہیں۔

ہندو تو ہادیان اسلام ہیں۔ آیتیں صرف نصاریٰ کے بارے میں ہیں اور نہ کل نصاریٰ فقط انگریز۔ اور انگریز بھی کل تک اس کے مورد نہ تھے حالات حاضرہ سے ہوئے۔ ایسی ترمیم شریعت، وتغیر احکام، وتبدیل اسلام کا نام خیرخواہی اسلام رکھا ہے ترک موالات کفار میں قرآن عظیم نے ایک دو دس بیس جگہ تاکید شدید پر اکتفا نہ فرمائی بلکہ بکثرت جابجا کان کھول کھول کر تعلیم حق سنائی اور اس پر تنبیہ فرما دی کہ

قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيَاتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ "ہم نے تمہارے واسطے آیتیں صاف کھول دی ہیں اگر تمہیں عقل ہو" مگر توبہ کہاں عقل۔ کہاں کان، یہ سب تو وداد ہنود پر قربان لاجرم ان سب سے ہندوؤں کا استثنا کرنے کیلئے بڑے بڑے آزاد لیڈروں نے قرآن عظیم میں تحریفیں کیں۔

(رسائل رضویہ ص ۹۵)

اس کے ساتھ ہی امام احمد رضا علیہ الرحمہ اس باب میں ایک طویل بحث فرماتے ہیں

اور ہندوں کے اُن بے پناہ مظالم کا ذکر کرتے ہیں۔ اُنہوں نے کٹار پور، آرہ وغیرہ میں کئے گئے تشدد کا ذکر فرمایا۔ قرآن عظیم کو بر سر عالم پھاڑے جانے اور جلائے جانے کے واقعات بیان فرمائے۔ مسجدوں کو منہدم و مسمار کیا گیا، مسلمانوں اور اُن کے گھروں کو تیل چھڑک کر جلا دیا گیا ان حالات کے پیش نظر امام احمد رضا بڑے چبھتے ہوئے انداز میں دریافت فرماتے ہیں۔

> اب کوئی دردِ سینۂ مسلمان یہ کہہ سکتا ہے یا نہیں کہ اے اسٹیجوں پر مسلمان بننے والو ہمدردیٔ اسلام کا ظاہری تانا تننے والو! کچھ حیا کا نام باقی ہے تو ہندوں کی گنگا میں ڈوب مرو اسلام و مسلمین و مساجد و قرآن پر ظلم توڑنے والے کیا تمہارے بھائی تمہارے چہیتے، تمہارے پیارے تمہارے سردار تمہارے پیشوا تمہارے مددگار تمہارے غمگسار مشرکین ہند نہیں! جن کے ہاتھ آج تم بکے جاتے ہو۔ جنکی غلامی کے گیت گاتے ہو (رسائل رضویہ ص ۱۱۶)

مولانا ظفر علی برہم ہو گئے

مولانا ظفر علی گاندھی جی سے برہم ہو گئے اور پھر مولانا نے حسب عادت گاندھی جی کی ہجو لکھ کر ان کی مٹی پلید کر ڈالی۔ مولانا فیض احمد صاحب "مہر منیر" میں تحریر فرماتے ہیں

> اس اختلاف کی ابتدا کراچی میں کانگریس کے سالانہ اجلاس میں ہوئی کہ مولوی ظفر علی خاں جلسہ کی کارروائی نماز کیلئے بند کرانا چاہتے تھے کہ نماز کے بعد پھر شروع کیا جائے۔ گاندھی جی نے اس سے انکار کر دیا۔ جس پر یہ واک آؤٹ کر گئے۔
>
> گیٹ سے نکل رہے تھے کہ ایک ہندو خاتون رضا کار نے آوازہ کسا کہ "مولانا کیا آپ عرب سے تشریف لائے ہیں۔"
>
> (لہٰذا مولانا ظفر علی خاں نے گاندھی کی شان میں قصیدہ کہہ ڈالا)
>
> اے سامریٔ وقت کہ گاندھی ہے ترا نام — کہتے ہیں نصاریٰ کا تجھے بندۂ بے دام
> ہندو کو مسلمان سے لڑانا ہے ترا کام — ہمکو نظر آتا ہے جو ہوگا ترا انجام

اے دشمن اسلام

تقدیر وطن کی اُسی دن سے ہوئی کھوٹی ۔ جب شیخ کے تہمد سے ملی تیری لنگوٹی

اور چادر تہذیبِ عرب ہو گئی چھوٹی ۔ ہم قائل الہام ہیں تو مائل اوہام

اے دشمن اسلام

(مہر منیر ص ۲۷۸)

تمام مشرکین ہند محارب بالفعل ہیں

اس باب میں امام احمد رضا علیہ الرحمہ کے ارشادات سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ اُس دور کی تاریخ اور اُس وقت کے حملہ کوالف پر نظر ہو۔

اس میں قطعاً کوئی شبہ نہیں کہ وہ دور مسلمانان برصغیر کیلئے انتہائی نازک دور تھا اسلامی تشخص کی پامالی پر خود علماء کا ایک طبقہ کمربستہ نظر آرہا تھے یہ لوگ آیات الٰہی کے بے معنی تاویل اور فرمان خدا کی تحریف کے مرتکب ہورہے تھے اور یہ سب ہندوؤں کی محبت وچاہت اور اُن سے وداد و اتحاد کی بدولت ہو رہا تھا۔

ان علماء کرام سے جب یہ عرض کیا گیا کہ ہندوستان پر ظلم و ستم ڈھائے رہے ہیں۔ مسلمانوں کے نہ صرف گھروں، کھیتوں کو بلکہ اُنھیں بھی زندہ جلایا جا رہا ہے۔ قرآن کریم اور مساجد کی بیحرمتی کی جارہی ہے، شعائر اسلام کی ادائگی سے روکا جا رہا ہے۔ اور آپ حضرات ان سے وداد و محبت اور یگانگت کی باتیں کر رہے ہیں، حالانکہ مشرکین سے قتال کا حکم آیا ہے، خصوصاً جبکہ مشرک خود جارح ہوں۔ تو جواب یہ ملا کہ گاندھی جی تو ایسا نہیں کر رہے ہیں لڑائی کرنے والے ہندوؤں کے چند طبقے ہیں اس لئے آیات کے مصداق سب ہندو نہیں ہو سکتے۔ اور پھر امام وقت کا قلم برہم ہو گیا۔ رہوار قلم کی تیزی نے دلوں کو موہ لیا۔ فرماتے ہیں۔

> کیا زمانۂ رسالت جنکی نسبت حکم ہوا "اُنھیں (مشرکوں کو) جہاں پاؤ قتل کرو"
> اور حکم ہوا سب مشرکوں سے لڑو جیسے وہ تم سب سے لڑتے ہیں"
> کیا ان کا ہر ہر فرد میدان جنگ میں آیا تھا، در اصل لڑائی کے اسباب کو مدنظر رکھا جائیگا ۔۔۔ اگر جو لڑے اس کی خاص کوئی ذاتی غرض ہے جس میں ساری قوم

(کسی طور سے) شریک نہیں تو وہ لڑائی خاص انھیں لڑنیوالوں کیطرف منسوب ہو گی جو اس کے مرتکب ہوئے .... نہ تمام قوم کی اور اگر لڑائی مذہبی ہے تو اُن سب اہل مذہب کی ہے کہ باقی دامے درمے قلمے قدمے مُعیّن ہوں گے اور کچھ نہ ہو تو راضی ہوں گے اور اپنے مذہب کی فتح ہو تو خوش ہوں گے۔ اور دوسرے کی ہو تو رنجیدہ ہوں گے (جیسا کہ) اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا (اگر تمہیں بھلائی پہنچے تو انھیں بری لگے اور اگر تمہیں برائی پہنچے تو اس پر شاداں ہوں) (لہٰذا) (سب محاربین بالفعل ہیں خواہ ہاتھ سے زبان سے، یا دل سے

اور یہ قربانی گاؤ کا مسئلہ ایسا ہی ہے۔ کونسا ہندو ہے جسکے دل میں اس کا نام سُنا کر آگ نہیں لگتی کونسی ہندو زبان ہے جو کٹور رکھتا کا مالا نہیں جپتی۔ کونسا شہر ہے جہاں اس کی سبھا۔ یا اس کے ارکان، یا اس میں چندہ دینے والے نہیں، کیا یہ مقدس بے گناہوں کے خون۔ یہ پاک مساجد کی شہادتیں۔ یہ قرآن عظیم کی اہانتیں، انھیں ناپاک رکھشا وہ اُنہیں مجموعی سفاک سبھاؤں کے نتائج نہیں!

نہ سہی! ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ اب جس شہر، جس قصبہ، جس گاؤں میں چاہو آزما دیکھو، اپنی مذہبی قربانی کیلئے گائے پچھاڑو، اس وقت یہی تمہاری بائیں پسلی کے نکلے۔ یہی تمہارے سگے بھائی، یہی تمہارے منہ بولے بزرگ یہی تمہارے آقا، یہی تمہارے پیشوا تمہاری ہڈی پسلی توڑنے کیلئے تیار ہوتے ہیں یا نہیں؟

وہ جو آج تمام ہندوؤں اور نہ صرف ہندوؤں تم سب ہندو پرستوں کا امام ظاہر اور بادشاہ باطن ہے یعنی گاندھی صاف نہ کہہ چکا کہ مسلمان اگر قربانی نہ چھوڑیں گے تو ہم تلوار کے زور سے چھڑا دینگے

(رسائل رضویہ ص ۱۱۶)

یہ ہیں وہ مسکت دمسکت دلائل جن کے جواب سے یہ پورا طبقہ عاجز تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ سیدنا امام احمد رضا علیہ الرحمہ پر انگریز نوازی کا دل آزار بہتان لگایا گیا ورنہ انھیں چاہیے کہ کوئی ایسا دستاویزی ثبوت پیش کریں جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ امام احمد رضا نے انگریزوں کی حمایت کی تھی۔

بریلی میں ابوالکلام آزاد کا کھلا اجلاس اور صدرالشریعہ کا "اتمام حجت تامہ"

اس کے واقعات وکوائف کو جناب مفتی برہان الحق صاحب نے "اکرام امام احمد رضا" میں اور پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب نے "تحریک آزادی ہند اور السواد الاعظم" میں بڑی تفصیل سے ذکر فرمایا ہے۔

واقعہ یوں ہوا کہ غالباً مارچ ۱۹۲۱ء میں جمعیت العلمائے ہند کے زیر انتظام بریلی شریف میں ابوالکلام آزاد کا ایک کھلا اجلاس رکھا گیا تھا اور جھونک میں یہ اشتہار بھی شائع کر دیا گیا تھا کہ "مولانا آزاد اس اجلاس میں مخالفین پر اتمام حجت بھی کرینگے"۔

حالانکہ اس سے پہلے بریلی ہی میں جمعیت علماء ہند کا ایک اجلاس ہوا تھا اس موقع پر مولانا آزاد اور حضرت صدرالشریعہ علیہ الرحمہ (خلیفہ امام احمد رضا علیہ الرحمہ مصنف بہار شریعت اور حضرت علامہ شیخ الحدیث عبدالمصطفیٰ الازہری مدظلہ العالی کے والد ماجد) کے درمیان سیاسی امور پر گفتگو کرنے اور اختلافات کو ختم کرنے کیلئے مراسلت ہوئی تھی جو بے نتیجہ رہی تھی

اب جو جلسہ کا اعلان ہوا اور گفتگو کی دعوت دی گئی تو پھر علمائے کرام کا ایک وفد مرتب کیا گیا۔ اور حضرت صدرالشریعہ نے ستر سوالات مرتب کئے جسے "اتمام حجت تامہ" کے نام سے شائع کیا گیا اور نہ صرف منتظمین جلسہ بلکہ آزاد صاحب کے پاس بھی بھیجدیا گیا کہ انکے جوابات تیار رکھیں۔

اور پھر علمائے کرام کا یہ وفد جس کا ہر فرد علم وفضل کا ہالہ تھا رات کو ۹ بجے درود وسلام کا ورد کرتا ہوا جلسہ گاہ میں پہنچ گیا۔ رضا کاروں نے انھیں اسٹیج پر پہنچا دیا۔

آزاد صاحب نے پوچھا کہ آپ لوگوں کا صدر کون ہے۔ جواب میں جناب سید سلیمان اشرف صاحب پروفیسر علی گڑھ یونیورسٹی (جو امام احمد رضا علیہ الرحمہ کے خلیفہ تھے) نے فرمایا کہ میں ہوں

اور انھیں از راہِ نوازش چند منٹ خطاب کی اجازت دی گئی ۔ مگر اسی چند منٹ نے سماں بدل دیا ۔ اس کے فوراً بعد ہی فاضل بریلوی علیہ الرحمہ کے صاحبزادے حامد رضا خاں علیہ الرحمہ نے خطاب فرمایا اور تفصیل سے گفتگو فرمائی ۔

اور مولانا آزاد کو یہ بات کہنی پڑی کہ ”موالات جیسی نصاریٰ کیساتھ حرام ہے ہندو کیساتھ بھی حرام ہے“ اس کے بعد مفتی برہان الحق صاحب جبلپوری کے اعتراضات نے مولانا آزاد کو فق کردیا ۔ اور یہ وفد آگیا پھر کیا ہوا ؟ کیا مولانا آزاد اور ان کے متبعین نے ہندؤں کی تقلید سے توبہ کرلی ۔ ؟ ہرگز نہیں میں کہتا ہوں یہ علمائے کرام جنھیں انکی اولاد ”علمائے ربانی اور علمائے حق“ کہتے ہوئے نہیں تھکتی ”کتمان حق“ کے مرتکب ہوئے ہیں اور خدائے جبار وقہار کے حضور بہر صورت انھیں جوابدہی کرنی پڑیگی ۔

مولانا اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں

”یہ کیا بات کہ ان چیزوں سے ڈرتے نہیں ۔ حق کا اظہار کرتے ہوئے ڈرتے ہو

چنانچہ ان تحریکات میں دیکھ لو کہ ہندؤں کیوجہ سے کس قدر کتمان حق کیا گیا دین کو اور مسائل کو صاف بیان نہ کرسکے (افاضات الیومیہ حصہ ششم م۲ ص۲۵۸)

یہاں یہی کہا جاسکتا ہے کہ ۔۔۔ ع یہ نشہ وہ نہیں جسے ترشی اُتار دے

موالات کی تقسیم اور اس کے احکام

امام احمد رضا علیہ الرحمہ نے ”موالات“ کے جملہ اقسام پر سیر حاصل بحث فرمائی ہے ۔ چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں ۔

> موالات کی دو قسم ہے اول حقیقیہ جسکا ادنیٰ رکون یعنی میلان قلب ہے پھر وداد پھر اتحاد ۔ پھر اپنی خواہش سے بے خوف وطمع انقیاد پھر تبتل و
> یہ بجمیع وجوہ ہر کافر سے مطلقاً ہر حال میں حرام ہے
>
> (المحجۃ المؤتمنہ رسائل رضویہ ص۱۲۹)

اس کے ساتھ ہی آپ میل طبعی کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں ” وَلَا تَرْکَنُوْٓا اِلَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّکُمُ النَّارُ ۔ ظالموں کیطرف میل نہ کرو کہ تمہیں آگ چھوئے

اور پھر ارشاد ہوتا ہے۔

مگر میل طبعی جیسے ماں باپ اولاد... کی طرف کہ جس طرح بے اختیار ہو زیر حکم نہیں پھر بھی اس تصور سے کہ یہ اللہ و رسول کے دشمن ہیں ان سے دوستی حرام ہے بقدر قدرت اس کا دبانا یہاں تک کہ بن پڑے تو فنا کر دینا لازم ہے قال تعالیٰ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا اٰبَآءَکُمْ وَاِخْوَانَکُمْ اَوْلِیَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْکُفْرَ عَلَی الْاِیْمَانِ وَمَنْ یَّتَوَلَّھُمْ مِّنْکُمْ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (اے ایمان والو اپنے باپ، بھائیوں کو دوست نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر پسند کریں اور تم میں جو اُن سے دوستی رکھیگا وہی پکا ظالم ہوگا۔ المحجۃ المؤتمنہ

(رسائل رضویہ ص۱۳)

اس کے بعد موالات صوریہ کے احکام صادر فرماتے ہیں، مدارات کا بیان ہوتا ہے۔ حربی غیر معاہد سے موالات کی حالی صورت کے متعلق تفصیل بیان فرماتے ہیں۔ آیات مُمتَحِنَہ میں بِرّ و معاملات کی مراد کا ذکر ہوتا ہے۔ معنی اقساط کی تحقیق و توضیح فرماتے ہیں۔ پھر اس الزام کی تردید فرماتے ہیں کہ "مولانا احمد رضا انگریزوں کے خوش کرنے کیلیے مسلمانوں کا تباہ کرنیوالا مسئلہ نکالا ہے"۔ آپ فرماتے ہیں۔

مسائل سے خادمان شرع کا مقصود کسی مخلوق کی خوشی نہیں ہوتا صرف اللہ عزوجل بندوں کو اُس کے احکام پہنچانا وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ

سنئے! ہم کہیں واحد قہار اور اس کے رسولوں اور آدمیوں سب کی ہزار ہزار لعنتیں جس نے انگریزوں کو خوش کرنیکو تباہی مسلمین کا مسئلہ نکالا ہو۔

نہیں نہیں بلکہ اُس پر بھی جس نے حق مسئلہ نہ رضائے خدا و رسول نہ تنبیہ و آگاہی مسلمین کیلئے بتایا ہو۔ بلکہ اس سے خوشنودی نصاریٰ اس کا مقصود و مدعا ہو۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہیے کہ اللہ واحد قہار اور اسکے رسولوں اور ملائکہ اور آدمیوں کی ہزار در ہزار لعنتیں اُن پر جنھوں نے خوشنودی مشرکین کے لئے تباہی اسلام کے مسائل دل سے نکالے اللہ عزوجل کے کلام و احکام تحریف و تغییر

سے کایا پلٹ کر ڈالے۔ شعائرِ اسلام بند کیے، شعائر کفر پسند کیے، مشرکوں کو امام وہادی بنایا اُن سے وداد واتحاد منایا۔

(رسائل رضویہ ص ۱۲۲)

اس مقام پر آکر سوچ میں ایک ہیجانی برپا ہو جاتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ مجدد وقت امام احمد رضا علیہ الرحمہ کے اخلاصِ عمل کو ہزاروں ہزار سلام کرے جس نے جو کچھ کیا اللہ ورسول کیلئے کیا اہل ایمان کی فلاح واصلاح کیلئے کیا جس کے عمل میں نفسانیت کو قطعاً کوئی دخل نہیں تھا۔

کیا کوئی امام الہند، کوئی شیخ الہند، کوئی شیخ العرب والعجم اس نوعیت سے گفتگو کر سکتا ہے ! ہرگز نہیں۔ قدم قدم بے تماشا دولت سمیٹنے والے للّٰہیت کے اس بلندی تک نہیں پہنچ سکتے۔

آج تک تاریخ امام احمد رضا علیہ الرحمہ پر یہ دھبہ لگانے سے قاصر ہے۔ تمام تر دشمنی ومخالفت کے باوجود کوئی مورخ امام احمد رضا کے دامن کو حرص وآز جیسی لعنت سے آلودہ نہ کر سکا الحمد للہ علی منہ وکرمہ۔

امام احمد رضا علیہ الرحمہ پر زبردست الزام یہ ہے کہ وہ لوگوں کو کافر کہا کرتے تھے اور یہ بھی سراسر بہتان ہے امام احمد رضا نے آج تک کسی مسلمان کو کافر نہیں کہا۔ کافر صرف اُنھیں کہا گیا جو کفر کے مرتکب ہوئے۔ امام احمد رضا علیہ الرحمہ پر طنز کرنیوالے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ بالآخر انھیں کافر کس بنیاد پر کہا گیا ہے۔

کافروں، مشرکوں، منافقوں سے بھائی چارہ

معمولی سی سوجھ بوجھ رکھنے والا انسان بھی اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ مسلمان اور مشرک میں بنیادی نظریات کا اختلاف ہے اور یہ آپس میں کبھی بھی دوست نہیں بن سکتے۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جب بھی اور جہاں بھی اس کا تجربہ کیا گیا مسلمان اپنی تمام تر قوت وجبروت کے باوجود پامال ہو گئے یہی وجہ ہے کہ قائد اعظم محمد علی جناح، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی جیسے لوگ جنکی بے پناہ کوششوں کیوجہ سے کانگرس کانگرس بنی تھی اُس سے الگ ہو گئے کہ ہندؤوں کیساتھ ایک باضمیر وباعزت مسلمان کا

گذارہ ناممکن تھا۔ مگر ان علمائے کرام کو کیا کہا جائے جو شیخ القرآن اور شیخ الحدیث ہونے کے باوجود اپنے ایمان وضمیر کا سودا کر بیٹھے تھے کتنی عجیب بات ہے کہ اہل علم حضرات اجتماع ضدین کیلئے کوشاں تھے۔

امام احمد رضا علیہ الرحمہ فرماتے ہیں

قرآن عظیم کے صفحات مشرکین سے اتحاد و وداد حرام کرنے سے گونج رہے ہیں۔ لیڈرو! ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ (مصلحت شرعی تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ) جو فرماتا ہے لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ (کسی غیر مسلم کو اپنا راز دار مت بناؤ وہ تمہاری بدخواہی میں کمی (درگذر) نہ کرینگے انکی دلی تمنا ہے تمہارا مشقت میں پڑنا)

(رسائل رضویہ ص ۱۴۵)

مشرکوں سے عقد مواخات، بھائی چارہ۔ کہ برادران وطن ہندو بھائی اللہ عزوجل فرمائے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (مسلمان آپس میں بھائی ہیں) تم کہو نَحْنُ وَ الْمُشْرِكُوْنَ اِخْوَةٌ (ہم اور مشرکین آپس میں بھائی ہیں) (یعنی قرآن عظیم کے ارشاد کے مطابق اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (کیا تم نے دیکھا منافقوں کو کہ اپنے بھائی کافروں سے کہتے ہیں

(رسائل رضویہ ص ۱۵۱)

کافروں سے اتحاد کا حکم اور مولانا اشرف علی تھانوی کا اقرار

مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین وحق اندیش
خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند

تلخ یہ ہے کہ امام احمد رضا علیہ الرحمہ (بقول علامہ اقبال ع نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی) تلخ نوائی پر مجبور تھے۔ حال یہ تھا کہ کچھ ہم بھی کھسکتے ہیں کچھ تم بھی کھسک آؤ۔ ہندوؤں کا عقیدۂ خیر کوئی معنی نہیں رکھتا مگر صدمہ تو یہ تھا کہ مسلمان کھسک رہے تھے اور حد تو یہ ہے کہ شیخ ہند کے ماتھے پر قشقہ لگتا تھا۔ اور انھیں احساس تک نہیں ہوتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ادھر یہ بزرگی

ہوساک بات تھی۔ مولانا اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں

> تحریک خلافت میں تو بہت ہی زیادہ مسائل میں تحریف کی گئی بس جو مصلحت ہوتی گی اسی کو مسئلہ بناتے گئے کثرت سے عوام کو بدعقیدگی ہوگئی کہ کبھی کچھ کبھی کچھ ایسوں نے تو حقیقت کو ہی بدل دینا چاہا تھا مگر اللہ نے حفاظت فرمائی کہ ایک ایسی جماعت کو متعین فرما دیا کہ وہ اظہار حق کرتی رہی۔

(افاضات الیومیہ حصہ ششم ۲ ص ۳۱)

ان حالات میں ہنگوں کا نشین تہہ وبالا کرنے کیلئے ضروری تھا کہ موج تند جولاں کا عمل بھی جاری رہے۔ میں بالیقین کہہ سکتا ہوں کہ وہ جماعت جسکی طرف مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے اشارہ فرمایا ہے وہ اہلسنت وجماعت تھی جو امام احمد رضا علیہ الرحمہ کے پیرو اور متبع تھے جہاں نار وا مصلحت اندیشی، تملق وچاپلوسی اور جی حضوری کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اظہار حق کے معاملہ میں انھوں نے کبھی رو رعایت سے کام نہیں لیا۔ کبھی بھی لَوْمَۃَ لَائِمٍ کو خاطر میں نہیں لائے۔ اور نہ ہی یہ لوگ اشاروں اور کنایوں میں گفتگو کرنے کے عادی تھے۔ جو بات بھی کی گئی صاف کی گی۔ جو کچھ کہا گیا صاف کہا گیا۔ کیونکہ ؎

حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے اگر کانٹے میں ہو خوئے حریری

امام احمد رضا علیہ الرحمہ نے فرمایا "کافروں سے اتحاد کرنیوالے بحکم قرآن کافر ہیں" اور یہ بھی فرمایا کہ "کافروں کا حلیف بننا بھی حرام ہے"... بظاہر ان الفاظ میں بے پناہ تلخی محسوس ہوتی ہے۔ مگر کیا یہی حق نہیں؟

امام احمد رضا پر کفر سازی کا اتہام رکھنے والے کیا قرآن کو بھی جھٹلا دینگے۔! شاید حضرات یہ بھی کر گذریں علامہ اقبال نے بڑی سچی بات کہی ہے

ع خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں۔

> قرآن عظیم میں بیس سے زیادہ آیات ہیں اسے (یعنی کافروں سے وداد واتحاد کو) مردود وملعون فرما چکا۔ اور جابجا صاف ارشاد فرما دیا کہ ایسا کرنیوالے انھیں میں سے ہیں۔

وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ (اور تم میں جو کوئی ان سے دوستی رکھیگا وہ انھیں میں سے ہے) الیا کرنیوالے مسلمان نہیں لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَادُّوْنَ مَنْ حَادَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ۔

اسی طرح مشرکین کا حلیف بننا، انھیں اپنا حلیف بنانا (حالانکہ حلیف بنانا منسوخ ہوچکا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم فرماتے ہیں :- لَا تُحْدِثُوْا فِی الْاِسْلَامِ حِلْفًا اب اسلام میں کوئی حلف پیدا نہ کرو)

رب عزوجل فرماتا ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔

(اے ایمان والو وہ جو تمہارے دین کو ہنسی کھیل ٹھہراتے ہیں۔ جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور باقی سب کافر۔ ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ اور اللہ سے ڈرو اگر تم مسلمان ہو)

رسائل رضویہ ص ۱۵۲

مولانا اشرف علی تھانوی کی گواہی

آگے پڑھنے سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس موضوع پر مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی ایک عبارت بطور شہادت پیش کردوں۔ تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ جملہ الزامات اہلسنت وجماعت کے اختراع ہیں۔ فرماتے ہیں۔

خصوصًا اُن پر زیادہ افسوس ہے کہ جو مسلمانوں کے راہبر اور مقتدا کہلاتے ہیں اور جن کے ہاتھ میں انکی نکیل ہے جو ان کی کشتی کے ناخدا بنے ہوئے ہیں جو ان کے سیاہ وسفید کے مالک ہیں، وہ اُن کے لیڈر ہیں۔ لیکن ایسے لوگ کیا رہبری کرینگے جب خود گم کردہ راہ ہیں تو دوسروں کو کیا راہ بتائینگے۔ انھوں نے کافروں کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر مسلمانوں کو پسوادیا۔ اور مسلمانوں ہی کو کیا خود بھی ان چیزوں کا ارتکاب کیا جو ایمان اور دین کو خراب اور برباد کرنیوالی تھیں جے کے نعرے لگائے۔ پیشانیوں پر قشقے لگائے۔ ہندوؤں کی ارتھیوں کو

کندھا دیا رام لیلا وغیرہ کا انتظام مسلمان والنٹر لیوں نے کیا بیہودہ اور کفریہ کلمات زبان سے کہے کہ اگر نبوت ختم نہ ہوتی تو فلاں ہندو نبی ہوتا

(افاضات الیومیہ حصہ ششم ج ۲ ص ۲۰۳)

امام احمد رضا فرماتے ہیں

"مشرکین سے استعانت حرام ہے"

ان باب میں حیرت تو ان نام نہاد موحدین علماء پر ہے کہ جنھوں نے اہل اللہ بلکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) سے استعانت کو نہ صرف یہ کہ بلکہ کفر اور اس سے بھی آگے شرک تک قرار دیا ہے اور جس سے ان کی خود ساختہ "توحید خالص" مجروح ہوتی ہے۔ وہی حضرات کبھی انگریزوں سے استعانت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کبھی ہندوؤں سے ... لبا اوقات یہ حضرات اپنی توحید خالص کو منجملہ دیگر مسائل کے اس طرح لپیٹ کر رکھدیتے ہیں کہ ہوا تک نہیں لگتی "مسلمانوں سے وداد و محبت کے بجائے نفرت کرتے ہیں اور ہندوؤں سے یارانہ گانٹھتے ہیں۔ پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں

امام احمد رضا علیہ الرحمہ نے وہی بات فرمائی جو قرآن عظیم کا ارشاد ہے!

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِنْ دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ (اے ایمان والو اپنے غیروں کسی کو راز دار مت بناؤ وہ تمہاری بدخواہی میں درگذر نہ کریں گے ان کی دلی تمنا ہے تمہارا مشقت میں پڑنا دشمنی انکے مونہوں سے ظاہر ہو چکی ہے۔ اور وہ جو انکے سینوں میں دبی ہے وہ بڑی ہے بیشک ہم نے تمہارے سامنے نشانیاں صاف بیان فرما دیں اگر تمہیں عقل ہو)

قال اللہ تعالیٰ: بَشِّرِ الْمُنَافِقِينَ بِأَنَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا الَّذِينَ يَتَّخِذُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ أَيَبْتَغُونَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا .... (اے محبوب خوشخبری سنا دو منافقوں کو کہ انکے لئے دردناک عذاب ہے۔ وہ جو مسلمانوں کے سوا کافروں کو دوست بناتے ہیں۔ کیا انکے پاس عزت ڈھونڈتے ہیں عزت تو ساری خدا کے قبضے میں ہے)

قال اللہ تعالیٰ۔ لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰہِ فِیْ شَیْءٍ۔

(مسلمان مسلمانوں کے سوا کافروں کو مددگار نہ بنائیں اور جو ایسا کریگا اُسے اللہ سے کچھ علاقہ نہیں)

حاصل یہ کہ امام احمد رضا علیہ الرحمہ اور اُنکے خدام نیز علمائے کرام اور مشائخ عظام کی کثیر تعداد نے تحریک ترک موالات "متحدہ قومیت" پر سیر حاصل بحث کی ہے اور ناقابل تردید حقائق وشواہد سے ثابت کر دیا ہے کہ "تحریک ترک موالات" مسلمانوں کے مذہبی، ملی، قومی اور سیاسی تشخص وبقا کیلئے ہلاکت آفریں تھی۔

مقام بندۂ مومن کا ہے ورائے — زمیں سے تا — یا تمام لات ومنات

جھوٹ کا تعاقب

یہ عجیب بات ہے کہ ان سطور کے لکھنے کے دوران میں "روزنامہ جنگ لاہور" میں جناب محمد فاروق صاحب قریشی کا ایک مضمون بعنوان "عقیدہ یا سیاسی حکمت عملی" قسط وار نظر سے گذرا جس میں جناب محمد فاروق صاحب نے "دو قومی نظریہ" جناب سرسید احمد خاں کے "خیالات ونظریات" اور "متحدہ محاذ" پر خاصی معلومات افزا بحث فرمائی ہے۔ اور اس ضمن میں "سرسید احمد خاں" کی انگریز دوستی کا خاصا تذکرہ کیا ہے۔

مگر چند ایک باتیں ایسی بھی کہی ہیں جو سراسر غلط اور بہتان ہیں۔ اس باب میں ہمارا خیال یہ ہے کہ قریشی صاحب جان بوجھ کر امام احمد رضا علیہ الرحمہ پر "ہندوؤں سے اشتراک" کا الزام لگایا ہے تاکہ بعد والوں کیلئے "بطور سند" کام آئے۔ بہرصورت اس طویل بحث سے ہم ایک مختصر سا اقتباس درج کرتے ہیں۔

اب سرسید کے دن رات کانگرس کی مخالفت میں صرف ہونے لگے تاکہ ہندوستانیوں کے اتحاد سے برطانوی مفادات کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ انہوں نے مسلمانوں کو کانگرس سے دور رکھنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ کانگرس میں داخلہ کو حرام

اور کفر قرار دیا اور جواز یہ نکالا کہ اس جماعت میں ہنود کی شمولیت کے باعث مسلمانوں کا داخلہ جائز نہیں ہے۔ چنانچہ سرسید احمد خاں کے خلاف علمائے ہند نے ایک فتویٰ جاری کیا جس پر تمام مکاتیب فکر کے علما نے دستخط کئے اس فتویٰ کی رو سے کانگرس میں مسلمانوں کی شمولیت کو جائز ٹھہرایا گیا۔

مولانا احمد رضا خان بریلوی نے بھی کانگرس میں شمولیت کی حمایت میں فتویٰ جاری کیا جسکا متن حسب ذیل ہے!

۱۔ ہنود زمانہ سے معاملہ کرنا تحقیق شریعت جائز ہے۔ خصوصاً اس معاملہ میں انھیں شریک کرنا جس میں رفاہ عام نفع انام وحفظ حقوق ومروت مخلوق ہو کہ اس میں خاص انھیں کا فائدہ نہیں اہل وطن کا نفع ہے ایسی جماعت میں شامل ہونا جائز ہے۔

۲۔ سید احمد (سرسید احمد خاں) زبانی دعوئے اسلام کرتے ہیں حقیقت میں دام در بستر مار آستین ہیں ان کا زہر آلود فسوں انجام کار لوگوں کو ہلاک کر دیگا۔ اس لئے ان کے ساتھ ملنا شرعاً جائز نہیں (دستخط امام طبقہ علمائے بریلوی مولانا احمد رضا خاں بریلوی، ا ربیع الاول ۱۳۵۶ھ)

سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کو جن وجوہات کی بنا پر کانگرس میں شامل ہونے سے روکا تھا۔ مولانا احمد رضا خاں نے اپنے فتویٰ میں ان سب کی ایک ایک کر کے تکذیب کر دی ہے اور مسلمانوں کو کانگرس میں شامل ہو کر ہندوں کیساتھ مشترکہ جدوجہد کو از روئے اسلام جائز قرار دیا ہے.... اس غیر مبہم اور واضح فتویٰ سے بریلوی مسلک کے اصحاب علم پر اہم فرمہ داری عائد ہو جاتی ہے جس سے سبکدوشی ان کا اولین فرض ہے کیونکہ دو قومی نظریہ کو عقیدہ کا درجہ مولانا عبد الستار خاں نیازی نے دیا ہے (جنگ لاہور ۲۴ جنوری ۱۹۸۲ء)

قریشی صاحب اپنے اس مضمون کی روشنی میں کٹر کانگرسی معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں یہ بحث نہیں کہ سر سید احمد خاں کیا تھے اُنکے عقائد و نظریات کا رخ کیا تھا اور ...

کس درجہ کے انگریز پرست واقع ہوئے تھے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی امام احمد رضا علیہ الرحمہ اور انکے رفقاء کرام نے کانگرس میں شمولیت کا فتویٰ دیا تھا۔ اور کانگرس کی حمایت کی تھی؟

تو یہ فتویٰ تو قریشی صاحب کا خود ساختہ ہے۔ حیرت ہے کہ قریشی صاحب اس جھوٹ پر ذرا بھی نہیں جھجکے" روزنامہ جنگ لاہور سوموار ۵ اپریل ۱۹۸۲ء میں چھپنے والا یہ مضمون انتہائی گمراہ کن ہے یہاں لعنۃ اللہ علی الکذبین کے علاوہ صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ قریشی صاحب اُس فتویٰ کی فوٹو سٹیٹ شائع کریں یا کوئی ایسا دستاویزی ثبوت مہیا کریں جو ہمارے لئے قابل قبول ہو۔ غالباً قریشی صاحب کا مطمح نظر یہ ہے کہ ع خود تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔

قریشی صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ ؎

بوٹا بوٹا پتہ پتہ حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

مولانا تھانوی کو کیا کہینگے

میں سوچ رہا ہوں کہ امام احمد رضا علیہ الرحمہ پر کفر سازی کا الزام لگانیوالے مولانا تھانوی کو کیا کہینگے۔ اتنی بڑی بات تو امام احمد رضا علیہ الرحمہ نے بھی نہیں کہی تھی جتنی بڑی بات مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے نہایت سادگی سے کہہ ڈالی ہے اس موقع پر مجھے انھیں کی ایک گفتگو یاد آتی ہے۔ آپ نے فرمایا ہے

> تربیت و اصلاح کا کام بڑا نازک ہے اس میں بڑے ماہر فن کی ضرورت ہے اسی لئے میں کہتا ہوں کہ شیخ کامل ہونا، قطب ہونا، غوث ہونا ضروری نہیں ماہر ہونا ضروری ہے۔ بدون اسکے اصلاح و تربیت نہیں کر سکتا۔
>
> پھر ایک سوال پر فرمایا کہ شیخ کا متقی، پرہیزگار، زاہد عابد ہونا بھی ضروری نہیں جیسے طبیب جسمانی کہ وہ خود کیسا ہی بدپرہیز ہو لیکن ماہر فن ہو۔
>
> (الافاضات الیومیہ جلد ہشتم جزاول ص ۵۴)

یہاں ہم یہ بحث نہیں کرنا چاہتے کہ واقعۃً شیخ کو کیسا ہونا چاہیئے۔ پرہیزگار ہونا ہے صرف فنکار ہونا ہی کافی ہے!

البتہ مجھے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مولانا تھانوی یقیناً بہت بڑے ماہر فن تھے اور ایسے ... اعلیٰ درجہ کے فنکار تھے حسب ذیل عبارت کے بغور مطالعہ کے بعد مجھے یقین ہے کہ آپ بھی ...

ہوو جلے (سوداں فنکاری کے)

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ زمانہ تحریک خلافت میں کیرانہ جانا ہوا - ایک مولوی صاحب تحریک خلافت میں بڑی سرگرمی سے کام کر رہے تھے۔ مجھ سے ملنے آئے منطقی اور معقولی آدمی تھے - انہوں نے مجھ سے ان مسائل کے متعلق ایک سوال کیا میں نے جواب کے سلسلے میں کہا کہ منطقی قاعدہ ہے کہ "مرکب ادنیٰ اور اعلیٰ سے ادنیٰ ہوتا ہے خسیس اور نفیس کا مجموعہ خسیس ہوتا ہے" کہا کہ بالکل صحیح ہے میں نے کہا کہ اب میں پوچھتا ہوں کہ جو جماعت مرکب ہو مسلم اور کافر سے وہ مسلم جماعت ہوگی یا کافر کہا کہ کافر میں نے کہا کہ ترکی سلطنت میں جمہوریت قائم ہو چکی ہے۔ شخصیت نہیں رہی۔ اور وہ مرکب ہے مسلم اور غیر مسلم سے تو وہ اسلامی سلطنت ہوئی یا کیا۔ کہا کہ غیر مسلم سلطنت ہوئی۔ میں نے کہا شرعی اصول وقواعد سے جب وہ اسلامی سلطنت بھی نہ رہی اور خلافت تو بڑی چیز ہے تو پھر اس کی نصرت کیسی الخ

(افاضات الیومیہ جلد ہشتم جزو اول صـ۷)

بہر صورت تھانوی صاحب نے انھیں لاجواب کرنے کے بعد فتویٰ بھی دیا کہ ترکی کی مدد کرنی واجب ہے وہ اس لئے کہ دشمن تو اسلامی ہی سمجھتے ہیں۔ اسکے بعد وہ مولوی صاحب خوش ہو گئے اور دو روپے نذرانہ بھی پیش کیے جو بطیب قلب قبول کر لئے گئے۔

بیان کردہ قاعدے اور کلیہ کے تحت آپ بھی غور فرمائیں کہ کیا نتیجہ نکالا جاسکتا ہے مثلاً "جو جماعت مرکب ہو مسلم اور کافر سے وہ مسلم جماعت ہوگی یا کافر" آپ سوچئے کہ جو جماعت مرکب ہو مولانا مدنی اور گاندھی سے وہ مدنی جماعت ہوگی یا گاندھوی؟

یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ جو کلیہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ "مرکب ادنیٰ و اعلیٰ سے ادنیٰ ہوتا ہے خسیس و نفیس کا مجموعہ خسیس ہوتا ہے" درست ہے مثلاً پاک اور ناپاک کا مرکب ناپاک ہی ہوگا۔ باقی آپ خود ہی سوچ لیں۔

ھم اگر عرض کرینگے تو شکایت ہوگی۔

تحریک ہجرت

دورِ جنون بلاریب ۱۹۰۰ء سے ۱۹۴۰ء تک کا دور مسلمانان برصغیر کیلئے انتہائی خطرناک اور بھیانک دور کہا جاسکتا ہے۔ ان ماہ وسال میں مسلمان رہنما اگرچہ انتہائی پُرجوش اور متحرک نظر آتے ہیں۔ خصوصاً تحریک خلافت نے تو انھیں شعلہ بداماں کر دیا تھا۔ مگر تاریخ کے گہرے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ عرصہ دراز تک مسلمانوں کی سیاسی قیادت صحیح منزل کا تعین نہیں کر پائی تھی۔ اور نہ ہی انہوں نے اپنے لئے کوئی واضح راستہ متعین کیا تھا۔

جوش وجذبات کا ایک طوفان تھا جو امنڈا چلا آرہا تھا۔ اور اسکی لپیٹ میں آنیوالی کوئی چیز سلامت نہ رہ سکی اگر اسے ۱۸۵۷ء کا ردعمل کہا جائے تو یہ کچھ غلط نہ ہوگا۔ کیونکہ ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کو جن دردناک حالات سے گذرنا پڑا اور جو کاری زخم برداشت کرنے پڑے تھے اکی کسک ابھی باقی تھی۔

اب جب کہ گاندھی نے مسئلہ خلافت میں اشتراک عمل کا اعلان کیا تو مسلمانوں کی رگوں میں دوڑتے ہوئے خوں شعلے بن گئے "متحدہ قومیت" کا نعرہ لگا اور جذبات کی بے پناہ لہروں نے فراست کے سینے کو ڈبو دیا۔ اور پھر ہر طرف گاندھی ہی گاندھی نظر آنے لگے۔

میں اپنے آپ کو یہ کہنے میں حق بجانب سمجھتا ہوں کہ اس دور میں اکثریت کے سیاسی غلبہ کیوجہ سے مسلم قیادت مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ مسلمانوں کے طرز فکر میں نمایاں تبدیلی کا اظہار ہو رہا تھا۔ مشرکین سے گہرے ارتباط وتعلقات کیوجہ سے ذہنی انحطاط کا شکار تھے۔ بلکہ بحیثیت مسلمان کے کچھ سوچ ہی نہیں رہے۔

ان کے دل ودماغ پر گاندھی کے فلسفہ کی بڑی گہری چھاپ تھی اور وہ صرف در ہندوستان اور ہندوستانی" اور "برادران وطن" کا محدود تصور تھا اور بس

اسلام کے آفاقی نقطہ نظر کا کہیں سراغ نہیں ملتا تھا۔ اس کے بہت بعد مصر کے انقلابی لیڈر جناب صدر ناصر نے بھی اسی قسم کے نعرے لگائے تھے اور وقتی طور سے "قوم کے ہیرو" بن گئے تھے۔ "ہم فراعنہ کے بیٹے ہیں" "ہم عرب کے بیٹے" اور "فرزند صحرا"

ہیں وغیرہ وغیرہ جن سے وحدت ملی کی بنیادیں بکھر کر رہ گئیں۔ نتیجۂ آج بھی عرب پاش پاش ہیں

ہلاکت آفریں کلمات

بہرصورت اس دور جنوں میں بہت سی انہونیاں ہوئیں، جو نہیں ہونی چاہیے تھیں۔

- مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد ناگپور کے جمعہ کے خطبۂ اول میں مسٹر گاندھی کی تعریف توصیف فرمائی (اخبار مشرق گورکھپور سنہ ۱۹۲۱ء ۱۳ جنوری)
- جمعیت علماء ہند (دہلی) کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے (مولانا شوکت علی مرحوم) نے فرمایا۔ اے اللہ ہم سے ایک نیک کام بھی ہوگیا ہے یعنی میں اور مہاتما گاندھی یقینی بھائی بھائی ہوگئے ہیں۔ اور یہ محبت میں نے جان بوجھ کر بڑھائی ہے

(اخبار فتح دہلی ۲۴ نومبر سنہ ۱۹۲۱ء)

- رفاہ عام لکھنؤ کے جلسہ میں مولوی ظفر الملک اسحاق علی نے فرمایا

"اگر نبوت ختم نہ ہوگئی ہوتی تو مہاتما گاندھی نبی ہوتے"

(اخبار اتفاق دہلی ۲۷ اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء بحوالے ماخوذ از تحریک آزادی ہند اور اسواد الاعظم ص ۱۷۰)

حاصل یہ کہ ہندو اور ہندو لیڈر جو چاہتے تھے وہی ہوتا تھا اور مسلمان انکے ہر اشارے پر "بسر و چشم" اور "سر تسلیم خم ہے" سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔

مثلاً • گاندھی کے حکم سے ستیہ گرہ کے دن روزہ رکھا گیا۔ • وید کو الہامی کتاب تسلیم کیا گیا۔ • کرشن کو حضرت موسیٰ کا لقب مان لیا گیا • ہندوؤں کی طرف سے یہ تجویز آئی کہ مسلمان رام لیلا منائیں اور ہندو محرم (چنانچہ ہندوؤں نے تو محرم نہیں منایا البتہ مسلمانوں نے رام لیلا کا بندوبست کیا)

- اللہ کو رام کہا گیا سنکھ بجایا گیا۔ • مسجدوں میں ہندوؤں کی تقریریں کروائی گئیں۔
- رام لچھمن پر پھول چڑھائے گئے۔ • راماین کی پوجا میں شرکت کی گئی۔

اور حد یہ ہے کہ دیوبند کے شیخ الہند کا ارشاد ہوتا ہے۔

> کچھ شبہ نہیں کہ حق تعالیٰ شانہ نے آپ کے ہموطن اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر التعداد قوم کو کسی نہ کسی طریق سے آپکے ایسے پاک مقصد کے

حصول کیلئے مؤید بنا دیا ہے اور میں ان دونوں قوموں کے اتفاق کو بہت مفید اور منتج سمجھتا ہوں۔

(علمائے حق حصہ اول (محمد میاں))

اگر غور فرمایا جائے تو یہ بات نہایت آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ جناب "شیخ الہند" کیا فرمانا چاہتے ہیں۔

- ہمیں مولانا کی عبارت سے یہ تاثر ملتا ہے کہ ہمارے ساتھ ہندوں کا اشتراک عمل حق تعالیٰ جل شانہ اور ان مشرکین دونوں کا احسان ہے "کہیں ناشکری نہ کر بیٹھنا"، کیونکہ یہ اشتراک (مومن و مشرک) بڑا نتیجہ خیز ثابت ہوگا!

اور اس نتیجہ خیزی کو مولانا اشرف علی تھانوی سے سنئے۔

اشرف علی کا علماء دیوبند پر طنز

ادھر حکومت کے معاملہ میں مسلمانوں کو آگے کر دیا۔ اور بعض بدفہم اور بے سمجھ مسلمانوں کے جو راہبر تھے انکو بہلا پھسلا کر ہجرت کا سبق پڑھایا۔ ادھر شدھی کا مسئلہ جاری کرا دیا غرض کہ ہر طرح مسلمانوں کے جان، مال، جائیداد، مال زر، زمین گھر سب کا مالک اپنی قوم کو بنانا چاہتا تھا۔
یہ تھی اسلام اور مسلمانوں کیساتھ اسکی خیر خواہی اور ہمدردی لیکن یہ لیڈر نہ سمجھے اور نہ ان کے ہم خیال مولوی

(افاضات الیومیہ حصہ ششم ۲ ص ۳۰۳)

کاش یہ حضرات ہندوں کی سازش کو سمجھ سکتے۔ اور مومن کی فراست سے کام لیتے تو آج ہم بہت آگے ہوتے۔ جس قوت کو ہندوں کے بناؤ اور اپنی بگاڑ پر خرچ کیا اگر صرف قومی نقطہ نظر سے ملت کے سنوارنے پر خرچ کی جاتی تو صورت حال زیادہ اچھا نتیجہ دیتی۔

"تحریک خلافت" نے کئی لرزہ خیز تحریکیں بھی جنم دیں جن سے سامراجیوں اور ہندوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور مسلمانوں کے لٹے پٹے قافلے کی زبوں حالی اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔

تحریک ہجرت کی کہانی

"تحریک ہجرت" کی کچھ داستان جناب پروفیسر احمد سعید صاحب کی زبانی سنئے۔ اپنی کتاب حصول پاکستان میں تحریک ہجرت

کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

اس زمانہ میں ابو الکلام آزاد اور مولانا عبدالباری ندوی نے ہندوستان سے ہجرت کا فتوی جاری کیا مولانا عبدالباری نے ہجرت کے متعلق جو اعلان کیا وہ اخبار خلافت یکم مئی ۱۹۲۰ء سے نقل کیا جاتا ہے۔

ہجرت کے متعلق یہ عرض کرتا ہوں کہ وہ تمام مسلمان جو اپنے ضمیر، قلب ایمان کو مطمئن نہیں کر سکتے وہ اب اسلام کے احکام کے متعلق عمل پیرا ہوں وہ اس ملک سے ہجرت کر کے ایسے مقام پر چلے جائیں جہاں اسلام کی خدمت انجام دینا اور اسلامی قوانین کے مطابق عمل کرنا بہتر طریق پر ممکن ہو اس فتویٰ کا شایع ہونا تھا کہ ہزاروں مسلمانوں نے ہندوستان چھوڑنیکا فیصلہ کیا۔ اور افغانستان کیطرف روانہ ہو گئے۔

صرف ماہ اگست ۱۹۲۰ء میں ۱۵ پندرہ ہزار مسلمان افغانستان کیطرف چل دیے ایک اندازے کے مطابق کل مسلمان۔ جنھوں نے افغانستان ہجرت کی اُنکی تعداد پانچ لاکھ اور بیس لاکھ کے درمیان تھی۔ قاضی عبدالغفار اپنی کتاب حیات اجمل میں لکھتے ہیں۔ شروع میں تو ہجرت کی تحریک نے ایسا اثر پیدا کیا کہ ترک موالات کی تحریک بھی اسکے مقابلے میں ماند پڑ گی۔

افغانستان کی حکومت کے وسائل محدود تھے اتنی بڑی تعداد کے کھانے پینے اور رہائش کا بندوبست اسکے بس سے باہر تھا۔ چنانچہ افغانی حکومت نے اپنے دروازے بند کر دیے چنانچہ مجبوراً مسلمانوں کو واپس آنا پڑا۔ جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ ہزاروں مسلمان جو پہلے ہی تکالیف و مصائب برداشت کر کے افغانستان پہنچ پائے تھے۔ انکو دوبارہ پیاس اور بھوک کا سامنا کرنا پڑا۔

تحریک ہجرت ایک جذباتی تحریک تھی جس سے مسلمانوں کو بید نقصان پہنچا۔ بقول سید حسن ریاض (مصنف پاکستان ناگزیر تھا) یہی ایک قدم تھا جو مسلمانوں نے بے سوچے سمجھے اٹھایا۔ قاضی عبدالغفار اپنی کتاب (حیات اجمل

ہیں، تحریک کے بارہ میں یوں رقمطراز ہیں۔
یہ تحریک سیاسی حیثیت سے ناقص تھی۔ حکیم اجمل خاں اس تحریک سے سب سے زیادہ غیر مطمئن تھے ان کی رائے میں ترک وطن ہی کی تحریک ہر طرح سے وطن پرستی کی نفی تھی۔
وہ کہتے تھے کہ آزادی کی جنگ وطن ہی کی سرزمین پر لڑی جانی چاہئے۔ چند روز ہی بعد اس غلط تحریک کی غلطی کا لوگوں کو احساس ہوا۔ اور مہاجرین کو سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔

(حصول پاکستان ص ۱۴۲)

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم

بہر صورت ہر مؤرخ یہ لکھنے پر مجبور ہے کہ تحریک ہجرت بالکل غلط تحریک تھی جس کی ہلاکت آفرینی سے کوئی دیانتدار اہل قلم انکار نہیں کرسکتا۔ اور یہ صورت حال اسلامی نقطۂ نظر سے بھی مخدوش تھی اس دور میں بھی۔ مسٹر گاندھی ہی عقل کل نظر آتے ہیں۔ اور وہ مسلمان لیڈروں کو جو سبق پڑھاتے تھے انتہائی خطرناک تھے۔ اس دور میں اسلامی تشخص اور شعائر اسلام کو پامال کیا جا رہا تھا مگر مسلم قیادت بے خبری بلکہ بے صبری کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ نہیں کہا جاسکتا کہ آخر کیوں! اور تحریک ہجرت کے باب میں جناب رئیس جیدی تحریر فرماتے ہیں۔

ہندوستان کی تاریخ میں یہ دور بڑا پر آشوب دور ہے کیونکہ اس دور میں مسلمانوں کو اپنے غلط فیصلوں کی بنا پر شدید جانی، مالی اور ذہنی نقصانات اُٹھانے پڑے
ترک موالات نے انکو نہ صرف تعلیمی اداروں اور ملازمتوں سے محروم کردیا تھا۔ بلکہ ہجرت کے اعلان کے بعد وہ شدید مشکلات میں گھر کر رہ گئے۔ افغانستان کی جانب ہجرت کرنیوالوں کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کچھ تو سفر اور دشوار گزار راستوں کی صعوبتیں برداشت نہ کرکے موت کا شکار ہوئے۔ جو اُفتاں خیزاں افغانستان کی سرحد پر پہنچے۔ انھیں افغانی حکومت نے ملک میں

داخل ہونے سے روک دیا۔ کیونکہ اول تو افغانستان اور حکومت برطانیہ میں معاہدہ ہوگیا تھا اور وہ اپنے حلیف کی حکومت سے ہجرت کرنیوالوں کو پناہ دے کر حکومت برطانیہ سے تعلقات خراب کرنا نہیں چاہتی تھی۔ دوسرے اس مسئلے کا اقتصادی پہلو بھی تھا قیام اور روزگار کا مسئلہ حل کرنا افغانستان جیسے پسماندہ ملک کے بس کی بات نہیں تھی۔

(قائد اعظم کے بہتر۷۲ سال ص۱۶۹)

مجدد وقت کا اظہار حق

ان حالات میں ایک ایسی عبقری و ہمہ گیر صاحب بصیرت جراٗتمند شخصیت کی ضرورت تھی جو ان دبیز تہ در تہ تاریک پردوں کے اندر جھانک سکتی۔ کوئی ایسا مرد مومن جسکی فہم و فراست۔ دجل و فریب کی دھجیاں بکھیر سکتی اور مسلمان خود اپنی بقا کی جنگ کرتے اور ہندوؤں کی سرپرستی قبول کرنے سے انکار کر دیتے۔

اور پھر وہ مرد درویش، مرد حری امام احمد رضا کی شکل میں میدان میں آیا۔ اور برہمنی سازش کے تار و پو کو بکھیر دیا ۱۸۹۷ء میں پٹنہ کے عظیم الشان اجتماع میں سب سے پہلے "ہندو مسلم اتحاد اور ایک قومی نظریہ" کی بنیادیں اکھیڑ دیں۔ یاد رہے کہ منجملہ دیگر اعتراضات کے علمائے اہلسنت پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ انہوں نے تحریک ہجرت کی مخالفت کی اور اس کے ساتھ یہ فرما دیا کہ "یہ انگریزوں کے ایجنٹ تھے"

حق یہ ہے کہ اس باب میں امام احمد رضا اور ان کے رفقا کا موقف بالکل واضح اور غیر مبہم رہا ہے۔ اور آج بھی انکا نقطۂ نظر وہی ہے جو پہلے تھا۔ کہ برصغیر ہند میں رونما ہونیوالی تحریک ہجرت سراسر نا روا اور غلط تھی امام احمد رضا علیہ الرحمہ نے علی الرغم جملہ رہنمایان ہند شرعی، عقلی، سیاسی، سماجی اور معاشی و اقتصادی دلائل سے ثابت کر دیا تھا کہ یہ ہجرت شرعاً ہجرت نہیں اور ہر اعتبار سے ہلاکت خیز اور فلاکت آفریں ثابت ہوگی۔

جس کی وجہ سے مخالف کیمپ میں زلزلہ طاری ہوگیا۔ اور ناروا الزامات کے طوفان برپا کر دئیے گئے۔ اس تحریک ہجرت کے سلسلے میں امام احمد رضا "المحجة المؤتمنة" میں تحریر فرماتے ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ میرا کلام انھیں برا لگے گا اور حسب معمول تحقیق حق اور اظہار احکام رب انام کا نام گالیاں رکھا جائیگا۔ ہمیشہ عاجز دل نے اپنا عجز یوں ہی چھپایا ہے احکام حق کو سختی بتا کر گالیاں ٹھہرا کر جواب حق سے گریز کا حیلہ بنایا ہے۔ لہٰذا دست بستہ معروض کہ تھوڑی دیر نیچری تہذیب سے نیچے تنزل فرما کر وہ آیتیں کہ شروع فتویٰ میں تلاوت ہوئیں۔ ان پر ایمان لا کر ان مباحث علمیہ اور احکام الٰہیہ کو بغور سن لیجئے۔ اگر بالفرض باطل ہماری غلط فہمی ہے۔ حق و انصاف سے بتا دیجئے ہمیں بحمد اللہ ہرگز وہ نہ پائیے گا۔ جو سمجھ لینے کے بعد باطل پر اصرار حق سے انکار۔ نار حق پر عار اختیار کر رہے ہیں۔

(المحجۃ المؤتمنۃ رسائل رضویہ ص۱۹۷)

سطور بالا میں غور فرمائیے۔ اور انصاف سے بتائیے کہ امام احمد رضا علیہ الرحمہ کے متعلق کتنا غلط اور افسوسناک پروپگنڈہ کیا جا رہا تھا (جواب بھی پورے شدومد سے جاری ہے) آپ فرماتے ہیں کہ مجھے قرآن وسنت کی روشنی میں دلائل وبراہین سے قائل ومطمئن کیا جائے میں ہر وہ اچھی بات جو احکام الٰہیہ کے مطابق ہوگی تسلیم کرلوں گا۔ مگر امام احمد رضا علیہ الرحمہ کے ان واضح ارشادات کے باوجود انکے خلاف محاذ آرائی جاری رہی۔ آپ فرماتے ہیں۔

ہجرت کا بھرا دیا گیا کہ کسی طرح یہ دفع ہوں ملک ہماری کیڈیاں کھیلنے کو رہجائے یہ اپنی جائدادیں کوڑیوں کے مول بیچیں یا یوں ہی چھوڑ جائیں بہرحال ہمارے ہاتھ آئیں۔ انکی مساجد ومزارات اولیا ہماری پامالی کو رہجائیں۔

(رسائل رضویہ ص۲۰۳)

یہ بات بالکل درست ہے کہ مسلمانوں کی تحریک ہجرت گاندھی جی کے زرخیز ذہن کی پیداوار تھی   انھوں نے اپنے ہمنوا علمائے کرام کو یہ مشورہ دیا تھا کہ "اب مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ افغانستان کیطرف ہجرت کر جائیں" اور ان حضرات نے فتویٰ لکھ مارا اور ہجرت شروع ہوگئی۔ مگر خود ان لوگوں کا کردار کیا رہا امام احمد رضا علیہ الرحمہ کی زبانی سنئے۔

> ہجرت کا غل مچایا اور اپنے آپ ایک نہ سرکا۔ جو اُبھانے میں آگئے اُن
> مصیبت زدوں پر جو گذری، گذری یہ سب اپنے جورو بچوں میں چین سے رہے
>
> (رسائل رضویہ ص۲۰۰)

اور یہ امر واقعی قابلِ غور ہے کہ تحریک ہجرت کے بانیوں اور ہجرت کے نعرہ بازوں میں سے چند ایک کے علاوہ ایک بھی قابلِ ذکر فرد نے ہجرت نہیں کی (دو تین بڑے لوگ جو گئے انکی مصلحت اور تھی نہ کہ ہجرت)

ہجرت کرنیوالوں میں اکثریت اُن سادہ لوح مسلمانوں کی تھی جن کے سینے احترام شریعت کی آماجگاہ تھے اور جو ان رہنمایانِ دین وملت کی باتوں پر بھرپور یقین رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک مقام پر امام احمد رضا علیہ الرحمۃ ان مسلم قائدین کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

> اور بفرض غلط اور بفرض باطل، اگر سب مسلمان زمینداریاں، تجارتیں، نوکریاں تمام تعلقات یکسر چھوڑ دیں تو کیا تمہارے جگری خیرخواہ جملہ ہنود بھی ایسا ہی کرینگے تمہاری طرح نرے ننگے بھوکے رہجائینگے؟ حاشا ہرگز نہیں، زنہار نہیں
>
> (رسائل رضویہ ص۲۰۲)

ہمیں اس مقام پر غیر متعصبانہ طور پر سوچنا پڑے گا کہ اگر ہجرت والی فرنگی و برہمنی سازش کامیاب ہوجاتی تو برصغیر میں مسلمانوں کا مستقبل کیا ہوتا۔ کیا پورے اندلس میں جو کھیل تلواروں اور سازشوں کے بل بوتے پر کھیلا گیا وہی کھیل گاندھی اور اسکے ہمنوا برصغیر میں کھیلنا نہ چاہتے تھے۔

کیا وہ سرزمین جس کو علی ہجویری، معین الدین چشتی اور دیگر اولیائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ عنہم کی سرزمین ہے یوں بے یار و مددگار چھوڑ دی جاتی؟۔

کیا اس تاریخی حقیقت سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ وہاں بھی بے ضمیر علماؤں اور رہنماؤں نے درہم و دینار کے بدلے ضمیر فروشی کی تھی اور یہاں بھی تقریباً یہی صورت حال تھی ہم آگے چل کر بتائینگے کہ کن کن حضرات نے کہاں کہاں سے استفادہ فرمایا تھا اور فرمائے ہیں یعنی ؎ رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔

یہاں ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ تمام مسلمان قصداً اُس سازش میں شریک تھے یا اُن میں

اخلاص کی کوئی کمی تھی بلکہ بہت سے رہنما ایسے بھی تھے جنکا ہر عمل اخلاص پر مبنی تھا او حالات کو سمجھتے ہی وہ کانگرس سے جدا ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنی غلطیوں کا کفارہ بھی ادا کیا ایسے لوگوں کیلئے ہم زیادہ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت اُسوقت اُنکے سوچنے کا انداز صحیح نہیں تھا۔

مگر کچھ علماء اور انکے متبعین اور کچھ پڑھے لکھے دانشور کہلانیوالے حضرات جن پر ملت کی بے شمار ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں انہوں نے علم و معرفت کے باوجود ہیجاہٹ دھرمی اور ضد سے کام لیا۔ اچھا نہیں کیا۔

بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اُن حضرات کی سوچ پاکستان میں رہتے ہوئے بھی وہی ہے جو تقریباً نصف صدی پہلے تھی تو غلط بات نہیں ہوگی۔ افسوس کہ ارض پاک کے نان نمک نے اُن کا ذہن نہیں بدلا۔

حاصل یہ کہ چند سالوں کے بعد ہی حالات و واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ مسلمان رہنماؤں نے ہندو اکثریت کے بارے میں جو رائے قائم کی تھی یکسر غلط تھی انکی دوستی انکی چاہت، اُن کا پیار، اُن کی محبت سراسر فریب اور دھوکا تھا۔ اور صحیح وہی تھا جو امام احمد رضا علیہ الرحمہ اور اُنکے رفقاء نے قرآن و حدیث کی روشنی میں کہا تھا۔

ع مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارا

تلوار کون اٹھائیگا

سچ یہ ہے کہ انگریز اور ہندو دونوں ہی یہ چاہتے تھے کہ مسلمان برصغیر سے نکل جائیں اگر اس شاداب سرزمین پر برٹش حکومت کو کوئی خطرہ تھا تو وہ صرف اور صرف مسلمانوں سے تھا۔ اس کی منطقی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں نے سالہا سال کی خونریزی و سازش کے بعد مسلمانوں ہی سے برصغیر کی حکومت چھینی تھی اور اب فطری تقاضا کے مطابق مسلمان ہی اپنی کھوئی ہوئی حکومت لینے کیلئے سر اُٹھا سکتے تھے۔ اور صدیوں کا تجربہ بھی انگریزوں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا تھا۔

جیسا کہ خود مسٹر گاندھی نے اپنے انگریز آقاؤں کے نام ایک یادداشت میں اس کی وضاحت کی ہے۔

میرا مذہب آپ سے خصومت رکھنے سے منع کرتا ہے میں اپنے ہاتھ آپ

> پر کبھی نہیں چلاؤں گا۔ خواہ میرے پاس اتنی طاقت بھی ہو جائے۔ میں خود مصیبت جھیل کر آپ پر فتح پانیکی امید رکھتا ہوں۔
> علی برادران بیشک اپنے ملک وملت کی حمایت میں تلوار اُٹھائینگے۔ اگر ان سے ہوسکا تو
> (اخبار تاج جبل پور، نومبر ۱۹۲۰ء از تحریک آزادی ہند اور اسواد الاعظم ص۱۱۵)

ملاحظہ فرمایئے۔ یہ دورخی (بلکہ دوغلاپن) اُس شخص کی ہے جو بیک وقت ہندوں اور مسلمانوں کا قائد کہلاتا تھا جس پر مسلمانوں نے بھرپور اعتماد کیا تھا جسکی اتباع کے فتوے دارالعلوم دیوبند سے جاری ہوتے تھے جس کی خاطر مسلمانوں نے اپنے علماء ومشائخ کی توہین و تذلیل کی بھی جسکو بھی علی برادران باپو کہتے نہ تھکتے تھے۔ بظاہر مسٹر گاندھی نے سیاسی زبان ولہجہ اختیار کیا ہے یعنی "علی برادران بیشک اپنے ملک وملت کی حمایت میں تلوار اُٹھائینگے اگر اُن سے ہوسکا تو" مگر واقعہ یہ ہے کہ گاندھی نے انگریزوں کو آگاہ کیا تھا کہ علی برادران شمشیر بکف ہوچکے ہیں ہوشیار ہوجائیں۔ اسی طرح اپنا اور اپنی قوم ہندوں کا تحفظ بھی کیا ہے یہی وجہ ہے کہ انگریز مسلسل مسلمانوں کو پامال کر رہے تھے جب کہ ہندوں کی بھرپور عزت افزائی کیجارہی تھی۔

اور یہاں تو ابھی جنگ حریت ۱۸۵۷ء کے خونی آثار بھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ جسمیں مسلمانوں نے حیرت انگیز جرأت وہمت اور ناقابل یقین صبر واستقامت کا مظاہرہ کیا تھا۔ اگرچہ انگریزوں نے بے پناہ ظلم وستم کے ذریعہ وقتی طور پر اس جذبہ بے پناہ کو کچل ڈالا تھا۔ مگر یہ آتش فشاں کسی وقت بھی پھٹ سکتا تھا۔

انگریز اچھی طرح جانتے تھے کہ برصغیر ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں مسلمان ہی وہ واحد قوم ہے جو کسی قیمت پر غلامی قبول نہیں کرسکتی۔ بلکہ یہ قوم تو خود غلام آزاد کرنے کو بہت بڑی نیکی تصور کرتی ہے۔

اور دنیا میں مسلمان ہی وہ واحد قوم ہے جو مذہبی طریقہ پر مساوات وہمسری کا برتاؤ کرتی ہے اور اونچ نیچ ذات پات کا تصور نہیں رکھتی۔

مسلمان وہ واحد قوم ہے جس میں آقا و غلام ایک دستر خوان پر کھاتے ہیں اور ایک ہی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور صرف مسلمان ہی وہ واحد قوم ہے جسکے سینے میں جذبہ جہاد کا ایک بیکراں سمندر ٹھاٹیں مار رہا ہے جو قتل ہونے کو شہادت اور جان دینے کو عبادت اور ممات کو حیات سمجھتی ہے۔ لہٰذا اس کو جتنا بے دست و پا کر دیا جائے انگریزوں اور ہندؤں دونوں کے حق میں مفید اور سودمند ہوگا اور یہ بڑا کام انگریزوں نے "برادرانِ وطن" ہندؤں کے ذریعہ لیا اور مسلمان رہنما ہندؤں کے بھرّے میں آگئے۔

• ہندو مسلم اتحاد کے چکر میں گاندھی نے مسلم رہنماؤں کو ہجرت کا چکر بھی دیدیا۔ اور مسلمان چکر کھا گئے، اور یہ تک نہیں سوچا کہ گاندھی کا قومی نشان ہی چکر ہے۔ عقل چکرائی اور ہجرت کا اعلان کر دیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان کس لئے ہجرت کریں۔ اور ترک وطن کیوں کیا جائے؟ کیا صرف اس لئے کہ انگریزوں پر دباؤ ڈالا جا سکے۔ اور انگریز اس دباؤ کے تحت برصغیر خالی کر جائیں۔

خدا کی پناہ! اس باب میں اتنی غیر دانشمندانہ حرکت کا تصور بھی اذیتناک ہے۔ بھلا سوچئے تو سہی اس ترک وطن سے مسلمانوں کو کیا مفاد حاصل ہوتا! یہ تو پہلے ہی گھر بار خالی کر کے مہاجر ہو چکے ہوتے۔ انکے تعلقات اور ان کی جائدادیں پہلے ہی فنا ہو چکی ہوتیں۔ پھر انھیں اس دباؤ سے کیا حاصل ہوتا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ انھیں اس دباؤ سے کیا حاصل ہوا؟

سوراج بہر صورت ہندؤں کیلئے ہوتا۔ وہی اس پوتر دھرتی کے مالک کہلاتے۔ انھیں کی راجدھانیاں آباد ہوتیں۔ انھیں کے مندروں کے کلس چمکتے اور برصغیر کی شاداب وادیوں میں انھیں کی جیکار گونجتی۔ اور ہم افغانستان میں پڑے ہوتے۔ پھر کسی محمد بن قاسم اور محمود غزنوی جیسے مجاہدوں کا انتظار کرتے رہتے۔

اور یہ کہ جب انگریزوں کو بیدخل کرنے کیلئے "ہندو مسلم" اتحاد تھا تو پھر ہندؤں کو بھی اپنے برادرانِ وطن کیساتھ ترک وطن کرنا چاہیئے تھا (جو نہیں کیا گیا) آخر صرف مسلمان ہی کیوں ترک وطن کریں۔ اگر ترک وطن کا دباؤ ہندو اکثریت کیطرف سے ہوتا تو شاید زیادہ موثر ہوتا۔

اور یہ بھی عجیب بلکہ عجیب تر طرز فکر تھی کہ انگریزوں کو وطن سے نکالنے کیلئے (جو یقیناً قابض اور غیر ملکی تھے) خود وطن سے نکل جائیں (یعنی ہجرت کر جائیں) مقصد یہ کہ اگر دشمن کے لشکر کو شکست دینا ہو تو پہلے خود میدان سے فرار ہو جائے دشمن خود ہی میدان خالی کر جائیگا۔

یہی نہیں بلکہ غور فرمایا جائے تو یہ بھی ظاہر ہو جائیگا کہ انگریز مسلمانوں کی اس تحریک ہجرت سے خود کئی مفاد حاصل کرنا چاہتا تھا۔

دیکھنا یہ ہے کہ اگر برصغیر کے کروڑوں مسلمان جس اسلامی سلطنت کیطرف ہجرت کرتے وہاں کا حشر کیا ہوتا؟ بلاریب وہاں دفعتہً سیکڑوں مسائل پیدا ہو جاتے، سیاسی، معاشی، اقتصادی اور انتظامی مسائل دردناک صورت اختیار کر جاتے اور وہ ملک چند ہی دنوں میں شدید بحران کا شکار ہو جاتا۔

اسوقت یقیناً دنیا میں کوئی ایسی مضبوط اسلامی حکومت نہیں تھی جو اتنی کثیر تعداد مہاجرین کو برداشت کر سکتی۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس دور میں تقریباً جتنی بھی اسلامی حکومتیں تھیں خود عالم نزع میں تھیں دوسروں کی خبر گیری کیا کرتیں۔

اور ایک تماشہ یہ بھی ہوا کہ رہنمانِ ملت نے مرکز ہجرت افغانستان کو قرار دیا جو اس ترقی کے دور میں بھی انتہائی پسماندہ ہے اور اپنے معاملات میں دوسروں کے سہارے کا محتاج رہتا ہے۔

جہاں آج بھی خشک و سنگلاخ وادیوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے وہاں صنعت و زراعت دونوں ہی کو فروغ نہیں ہے۔ جو اپنی ضرورت کیلئے معمولی سے معمولی چیز بھی پیدا نہیں کر سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر برصغیر کے مسلمان پروگرام کے مطابق افغانستان پہنچ جاتے۔ تو زرد چشم بھیڑیوں کو بغیر کسی محنت و کاوش کے ایک نئی شکار گاہ ضرور مل جاتی۔ اور یہی کچھ ہندو بھی چاہتے تھے کہ جو کام انکے پرکھوں سے نہ ہو سکا۔ وہ کام انکے ولی نعمت انگریز بہادر کر ڈالیں اور محمد ابن قاسم سے لیکر عالمگیر تک کی روحوں سے اپنا ذہنی انتقام لے سکیں۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندو کسی دور میں بھی مسلمانوں کیساتھ مخلص نہیں رہے

اور نہ ہی کبھی اس سے اخلاص و مروت کی توقع کیجا سکتی ہے۔

ہم نہیں سمجھ سکتے کہ علماء کہلانیوالا ایک طبقہ کسی بنیاد پر "برادران وطن" اور "متحدہ قومیت" کا پروپگنڈہ کرتا رہتا ہے۔ اور وہ کونسی ایسی مصلحت ہے جو مسلمانوں کو چھوڑ کر مشرکوں کیطرف کھینچ رہی ہے۔ جبکہ خدا و رسول کے واضح اور صریح احکامات مشرکین سے دوستی و یگانگت کو منع کر رہے ہیں۔

حد یہ ہے کہ "مسلمانوں کے روشن مستقبل" کے مصنف نے اپنی یہ پوری کتاب شاید ایک کہانی کیلئے وقف کر ڈالی ہے کہ برصغیر میں صرف ایک ہی قوم ہے "ہندوستانی" ہندو مسلم تقریباً ایک ہی ہیں ماضی میں بھی ایک تھے۔ سلطان ٹیپو، سراج الدولہ اور مغلیہ خاندان سے بڑے گہرے روابط تھے بلکہ اصل کارپرداز ہی یہی تھے میں یہ کہتا ہوں کہ اگر یہ سچ ہے تو نتیجہ اُس سے کہیں زیادہ درست ثابت ہوا ہے۔

جیوت رام کا مولانا سندھی کو دلشکن جواب

یہ امر یقینی ہے کہ ہجرت کا شوشہ بھی ہندو نیتاؤں کیطرف سے ہی چھوڑا گیا تھا۔ جو مسلمانوں کی زبان پر آتے ہی خوفناک تحریک کی صورت اختیار کر گیا۔ ہندو اس طرح مسلمانوں سے اپنی سات سو سالہ غلامی کا انتقام لینا چاہتے تھے ہندو تو شاید یہ نہیں چاہتا تھا کہ مسلمان ہندوستان میں رہ کر زندگی اور سوراج میں حصہ دار بن سکے

چنانچہ دیوبندی رہنما مولانا عبید اللہ سندھی خود آپ بیتی سناتے ہیں

> جسوقت میں ناظم جمعیت الانصار تھا میرے ایک سندھی دوست پروفیسر جیوت رام کرپلانی دیوبند تشریف لائے۔ وہ دارالعلوم دیوبند دیکھنا چاہتے تھے۔ ایک ہفتہ تک میرے مہمان رہے انھیں پوری آزادی سے دارالعلوم کی سیر کرائی۔
>
> آخر میں وہ دارالعلوم کی بہت تعریف کرتے تھے کہ ہند کے مستقبل میں جو چیزیں کارآمد ہو سکتی ہیں وہ اس قسم کے کام ہیں۔
>
> اور دارالعلوم کی خدمات قابل تعریف اہمیت رکھتی ہیں
>
> اس پر میں نے سوال کیا۔ کہئے پروفیسر صاحب ہماری ضرورت ہے یا نہیں؟

اس کا جواب تھا بالکل نہیں۔ اگر آپ ضرورت سمجھیں تو ہمارے ساتھ ہو جائیں ورنہ ہند ہمارا ہے۔ اور ہم اپنا کام خود کرینگے۔ اس جواب کا اثر مجھ پر ظاہر ہے کہ اچھا نہیں ہوا۔

(نقش حیات جلد دوم صفحہ ۵۲)

افسوس تو یہ ہے کہ اسلامی غیرت پھر بھی نہیں جاگی۔ وہی ڈگر تھی اور وہی راہرو۔

یہاں یہ پوچھا جا سکتا ہے کیا اس وضاحت کے بعد بھی یہ کہنے کی ضرورت رہجاتی ہے کہ "ہندو کے دل میں کیا تھا" اور ان کے تاریک دلوں میں مسلمانوں کے خلاف کتنے خوفناک شعلے دہک رہے تھے۔

حاصل یہ کہ ترک وطن "ہجرت" کا شوشہ صرف اور صرف اس لئے چھوڑا گیا تھا کہ مسلمانوں کے انخلا کے بعد اکھنڈ بھارت کے تصور کو عملی جامہ پہنایا جا سکے۔

جیسا کہ جناب پروفیسر محمد خلیل اللہ صاحب اپنی کتاب "تحریک پاکستان" میں تحریر فرماتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد انگریز مسلمانوں سے انتقام لینے لگا تو ملک کے ہندو انگریز کی دوستی اور ہمدردی حاصل کرنے کی فکر میں لگ گئے کوشش یہ ہونے لگی کہ ہر وہ اعزاز و امتیاز جو طویل دور حکومت میں مسلمانوں کو حاصل تھا اُن سے چھین لیا جائے، زمینداری، ملازمت وسائل معاش غرض ہر میدان سے مسلمان بیدخل کئے جانے لگے۔

(تحریک پاکستان صفحہ ۳۲)

اور یہی جناب پروفیسر محمد خلیل اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ ہندو قطعاً نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان کسی طور بھی ہندوستان میں رہیں چنانچہ لکھتے ہیں۔

ڈاکٹر مونجے کا نظریہ:-

جس طرح انگلستان انگریزوں کا ہے۔ فرانس فرانسیسیوں کا اور جرمنی جرمنوں کا۔ اسی طرح ہندوستان ہندوؤں کا ہے۔ اگر ہندو منظم ہو جائیں تو

وہ انگریزوں اور اُن کے پٹھو مسلمانوں کو مغلوب کر سکتے ہیں

(تحریک پاکستان صہ ۱۶۵)

ہردیال کی وضاحت

اس بات کی جو پروفیسر جیوت رام نے مولانا عبیداللہ سے کہی اور اُس بات کی جو ڈاکٹر مونجے نے بیان کی "ہردیال" وضاحت کرتے ہیں۔

ہمارے درمیان ایسے لوگ بھی ہیں جو بلا وجہ آزادی ہند کی تحریک میں نیم عرب اور نیم ایرانی مسلمانوں کو بھی شامل کرنا چاہتے ہیں۔ انھیں خبر نہیں کہ قومی مملکت اپنی قدیم قومی روایات اور اداروں کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔
اور یہی عناصر مملکت کے باشندوں کو متحد کر سکتے ہیں۔ ہندوستان مسلمان تو محض ایک غیر متعلق اور غیر ضروری عنصر ہیں

(تحریک پاکستان صہ ۱۶۶)

ظفر احمد ایبک کی گواہی

جناب ظفر احمد صاحب ایبک جو دیوبندی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں اور انھیں جناب عبیداللہ سندھی سے شرف تلمذ بھی حاصل ہے۔ اور یہ ہجرت ہی کے سلسلے میں افغانستان ہوتے ہوئے ترکی تک جا پہنچے تھے اور وہاں کپتان کے عہدے تک ترقی کی تھی اپنی "آپ بیتی" حصہ اول میں تحریر فرماتے ہیں۔

اس پر صوبہ یوپی کے مولانا عبدالباری مرحوم نے ہندوستان کو علمائے دیوبند کیطرح دارالحرب قرار دے کر فتویٰ کہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ یہاں سے ہجرت کر کے کسی دارالاسلام میں چلے جائیں اس پر پنجاب اور صوبہ سرحد کے مسلمانوں میں ہجرت کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

(آپ بیتی حصہ اول صہ ۲۰۹)

پھر کچھ آگے چل کر اس اجمالی کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔

انگریزوں نے جن کو افغانستان کی مالی کمزوری اور ہندوستان کی تحریک ہجرت کی

بے سروسامانی کا خوب علم تھا تحریک کو ناکام بنانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اسکے کارندوں نے ہندوستان میں لوگوں کو سبز باغ دکھائے اور کہا کہ وہ کابل پہنچتے ہی مالدار ہوجائینگے۔ گورنمنٹ کے بعض ایجنٹوں نے انکے مذہبی جذبات بھڑکا کر انکو ہجرت کی ترغیب دی۔ اور اس طرح پر اس تحریک کو افغانستانی اور پنجابی اور سرحدی مسلمانوں کیلئے ایک رحمت کے بجائے ایک آفت بنادیا۔

(آپ بیتی حصہ اول ص ۲۱۱)

اب اس مقام پر ایبک صاحب سے کسطرح پوچھا جائے کہ آپ کیا فرمانا چاہتے ہیں انکی یہ تحریر بڑی معنی خیز معلوم ہوتی ہے۔ اور ویسے بھی اس مختصر سی عبارت اور حقیقی واقعات میں زبردست تضاد محسوس ہوتا ہے پھر بھی اسکی گہرائی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

غضب یہ ہے کہ ہجرت کا فتویٰ مولوی عبدالباری اور علمائے دیوبند جاری فرمائیں اور ہندوستان کو دارالحرب یہ حضرات قرار دیں۔ اور گلی گلی یہ ترانا زبان زد ہو کہ

دریائے اٹک کے پار چلو قندھار چلو قندھار چلو

اور حسب عادت کارستانی انگریزوں کے ایجنٹوں کی ثابت کیا جائے۔ اور حد یہ ہے کہ جناب ایبک نے بھی اپنے چند ساتھیوں سمیت ہجرت کی تھی۔ یہ کس فرنگی ایجنٹ کا شکار ہوئے تھے؟

پھر یہ کہ اگر ایبک صاحب کی بات تسلیم کرلی جائے تو (بلکہ ضرور تسلیم کرلینی چاہیے) کیونکہ انھوں نے بچشم خود وہ سبز باغ دیکھے تھے اور ترک وطن کیا تھا۔

ہجرت کا پروپیگنڈہ کرنیوالے اور مذہبی جذبات بھڑکانیوالے انگریزوں کے ایجنٹ تھے جنھوں نے ہجرت کی ترغیب دی تو فتویٰ دینے والے علمائے دیوبند اور اصرار کرنیوالے ہادیان دلبند کو کیا کہا جائیگا جنھوں نے بھڑکانیوالا کام نہایت اعلیٰ پیمانہ پر کیا تھا۔

بلکہ ہجرت سے روکنے والوں کو اُسوقت انگریزوں کا ایجنٹ کہا جارہا تھا اور بعد میں بھیجنے والوں کو ایجنٹ کہا جارہا ہے کاش یہ منطق ہمیں کوئی سمجھا سکتا۔

اور جناب ایبک کی مراد یہ نہیں تو پھر کیا ہے "ہجرت کے فتوئ پر سادہ لوح مسلمانوں نے اپنے گھر اور کھیت آدھے مول پر بیچ دئے اور نتیجہ و عافیت کو سوچے بغیر افغانستان کیطرف روانہ ہو گئے" آپ بیتی صـ ۲۱۰

اب یہاں یہی کہا جا سکتا ہے کہ

ے تو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بے ننگ و نام ہے ۔۔۔ یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

اور یہ سادہ لوحی بھی اچھی رہی۔ مسلمان اپنا گھر اور کھیت آدھے دام نہ بیچتے تو کیا کرتے ایک طرف فتویٰ کا زور تھا دوسری طرف رہنمایانِ ملت کی شمشیر برہنہ تھی اور تیسری طرف سازشی ہندوؤں (یعنی برادران وطن) کی ترغیب و تحریص تھی اور چوتھی طرف سنگلاخ وادیوں کا راستہ کھلا تھا۔ اُدھر ہی چل پڑے مگر افسوس کہ وہ بھی بند ہو گیا اور بیوقوف کہلائے۔

بیچاری پردہ پوش عورتیں وہاں سخت مشکلات میں مبتلا ہوئیں بعض بد اخلاق کابلیوں نے اُن پر سخن اندازی کی۔ بعض لوگوں نے کھانا خریدنے کیلئے اثاثۃ البیت بھی فروخت کرنا شروع کر دیا۔ جسکے کابلیوں نے آدھے دام بھی نہ دئے۔

(آپ بیتی صـ ۲۱۳)

سیرت امیر ملت سے

اس باب سیرت امیر ملت کا تجزیہ بیحد قیمتی ہے کیونکہ یہ سیرت ایک عظیم بزرگ کی ہے جسکی عظمت سے اپنے تو اپنے پرائے بھی انکار نہیں کر سکتے۔ جنھوں نے اپنی طویل زندگی کا ایک ایک لمحہ خدمتِ دین و وطن میں صرف فرمایا۔ جو اپنی پوری حیات مبارکہ میں باطل کے سامنے سینہ سپر رہے جو بیک وقت المحافظ القاری المحدث تھا "سیرت امیر ملت" اُس مرد جلیل کی سیرت ہے جو خود ہر اسلامی تحریک میں نہ صرف پیش پیش تھا بلکہ اُسنے پوری ایمانی جرأت سے قیادت کی تھی۔

خلافت کی تحریک میں ازراہِ مداہنت ہندو لیڈر خصوصًا گاندھی مسلمانوں

کیساتھ تعاون کرتے رہے تھے، لیکن جیسا کہ شدھی تحریک سامنے آنے سے ظاہر ہو گیا، در پردہ مسلمانوں کے نقصان پہنچانے کے درپے تھے زمانہ خلافت کے جوش وخروش سے کام لینے کیلئے مسٹر گاندھی نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ انگریزی حکومت سے ناراضگی کے اظہار کیلئے مسلمان افغانستان کو ہجرت کر جائیں۔ مسلمان لیڈر اور علماء ہندوؤں کی اس چال کو نہ سمجھ سکے اور انہوں نے زور وشور سے ہجرت کی تبلیغ شروع کر دی

حضرت قبلہ عالم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے علی الاعلان تحریک کی مخالفت فرمائی اور مسلمانوں کو ہجرت سے باصرار اور بتاکید منع فرمایا

(سیرت امیر ملت ص۴۳۲)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام احمد رضا علیہ الرحمہ اور اُن کے رفقاء کار علماء دین اور بزرگان دین وملت مشائخ عظام اس "تحریک ہجرت" کے سخت مخالف تھے کیونکہ حق یہی تھا کہ ہجرت بہر صورت مسلمانوں کیلئے مفید نہیں۔

دربار عالیہ گولڑہ شریف

دوران تحریک خلافت مشائخ اہلسنت نے نہایت واضح طریقہ سے ایسی تحریکوں سے اجتناب فرمایا تھا جس میں مشرکین کا اشتراک یا اُن کی قیادت وسیادت ہو۔ اس سلسلہ دربار عالیہ گولڑہ شریف ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اور جسے تحریک خلافت کے زمانہ میں مشق ستم بنایا گیا، مگر خدا کے نور سے دیکھنے والی عظیم ہستی اپنے موقف اور اپنے نظریہ پر قائم رہی۔ اس سلسلہ میں آپ نے نہایت دلیری سے فرمایا تھا کہ میں گاندھی کی قیادت کو تسلیم نہیں کرتا۔ اور جب ہجرت کا دور شروع ہوا تو آپ نے اس کی بھی مخالفت فرمائی اس سلسلہ میں ایک واقعہ درج کیا جاتا ہے

حضرت قبلہ عالم قدس سرہ کے ایک ارادت مند مولوی صاحب نے ہزارہ سے لکھا کہ حضرت ہم تو اللہ کی راہ میں ہجرت کر رہے ہیں آپ پیری مریدی سنبھال کر بیٹھے رہئے۔

یہ صاحب اگلے مہینہ ہی اشک ندامت بہاتے ہوئے واپس لوٹ آئے اور کہتے تھے دراگر کابل کیطرف قبلہ ہوتا تو ادائگی نماز کیلئے بھی اسطرف رخ کرنے کو جی نہ چاہتا۔

(مہر منیر باب ۵ صہ ۲۷۹)

رہی بات انگریزوں کے ایجنٹ ہونے کی تو علماء کے اس خاص طبقے اور ان کے متبعین کا یہ وطیرہ رہا ہے بلکہ اب بھی ہے کہ ہر اُس فرد کو جو ان کی ہاں میں ہاں نہ ملائے اُسے ایسے ہی دلنواز خطاب سے نوازتے ہیں بالکل یہی خطاب قائد اعظم اور مسلم لیگ کو بھی عطا ہوئے تھے بلکہ انہوں نے اس عظیم خطاب سے اپنے بزرگوں کو بھی نہیں بخشا ہے

جناب شورش کا ذاتی تجربہ

جناب شورش ان حضرات کے جتنے ہی زیادہ ارادت مند تھے بعد میں ان کے عطا کردہ خطابات دلنواز شات سے اتنے ہی زیادہ دکھی ہوئے۔ چنانچہ اپنا ذاتی بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں

میرا ذاتی تجربہ ان لوگوں کے بارے میں یہ ہے کہ ان کا اسلام سے محض کاروباری واسطہ ہے

ان کے متعلق میرا یقین ہے کہ غایت درجہ کے خود فروش لوگ ہیں

(چٹان ۱۹ جنوری ۱۹۷ء صہ ۱۲)

علامہ مشرقی کا ہولناک انکشاف

یہاں ہم خاکسار رہنما علامہ مشرقی کے عقائد و نظریات اور اُنکے مذہبی و سیاسی حالات سے قطع نظر "تحریک ہجرت" کے باب میں اُن کا عندیہ پیش کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیں

اپنا الو سیدھا کرنیوالوں اور باقی تمام دنیا کو الو بنانیوالے ملانوں کی ہلاکت آمیز تعلیم کے اثر کو دور کرنے کیلئے میں نے ۱۹۲۰ء میں جبکہ یہ لوگ کانگریس کی نئی بھگت ہے

قوم کا پچھتر لاکھ روپیہ بے ڈکار ہضم کر گئے، اور پچیس ہزار مسلمانوں کو ہجرت ڈھکیل کر ہندوستان میں گاؤ تکیہ لگائے اپنی مونچھیں پونچھ رہے تھے

(اخبار الاصلاح لاہور ۲۸ جولائی ۱۹۲۹ء مسلمانوں کا روشن مستقبل ص۲۹۱)

سیاسی میدان میں مسلمانوں کی مکمل شکست

بہرصورت ایک آیا کہ مسلمانوں کا جوش وجذبہ اور انکی تمام قربانیاں گاندھی جی کے ہاتھوں انجام کو پہنچ گئیں اور سیاسی میدان میں مسلمانوں کو زبردست شکست ہوئی اور یہ سب گاندھی جیسے کٹر ہندو پر بھرپور اعتماد کیوجہ سے ہوا۔ جیسا کہ جناب ڈاکٹر قریشی لکھتے ہیں

> خلافت کے حق میں تحریک شروع ہوئی (رولٹ ایکٹ ۱۹۱۹ء) کے منظوری کے بعد تحریک ترک موالات کا پراشتعال واقعہ پیش آیا ۱۹۲۰ء تک برصغیر پاک و ہند اس کی لپیٹ میں آچکا تھا خلافتی لیڈروں کی گرفتاریوں نے "مشترک قیادت" کے نام پر تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات کی باگ ڈور کانگرس کے ہاتھ میں دیدی تھی جب مہاتما گاندھی نے یک لخت تحریک کے خاتمے کا اعلان کیا تو سیاسی میدان میں مسلمانوں کی شکست مکمل ہو چکی تھی۔
>
> (پاکستان کی نظریاتی بنیادیں ص۶۲ ڈاکٹر وحید قریشی)

باضابطہ خاتمہ

ان جملہ تحریکات کے متعلق جناب رضی حیدر لکھتے ہیں کہ

> دسمبر ۱۹۲۴ء کو بیلگام کے مقام پر گاندھی جی کی صدارت میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا جس میں بڑے حیرت انگیز فیصلے کئے گئے ایک قرارداد کے ذریعہ ترک موالات اور مقاطعہ کو باضابطہ ملتوی کر دیا گیا
>
> (قائداعظم کے بہتر سال ص۱۹۹)

انجام کار ع یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں۔

مولانا علی ندوی کا ارشاد

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے جو بات اپنی کتاب "پرانے چراغ" میں تحریر فرمائی ہے۔ اور جس رنج وغم کا اظہار فرمایا ہے۔ اُسکے صحیح ہونے میں شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر یہی بات جب بہت پہلے کہی گئی تھی۔ اور ان تحریکات کے مواقب و نتائج پر نظر رکھنے کیلئے علمائے حق نے فرمایا تھا انھیں انگریزوں کا ایجنٹ قرار دیا گیا تھا۔ علی ندوی فرماتے ہیں۔

بدقسمتی کی بات تھی کہ انہوں نے (محمد علی جوہر مرحوم) ایک ایسے مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لیا تھا اور اسکو اپنی سحر انگیز شخصیت کی توانائیوں اور قائدانہ صلاحیتوں کا محور بنایا تھا جس کی زمام کار انکے ہاتھ میں نہیں بلکہ ملک کے باہر سات سمندر پار ایک ایسی جماعت وفرد کے ہاتھ میں تھی (مصطفیٰ کمال) جو انکے مشوروں کا تابع اور انکی ہدایتوں کا پابند نہ تھا بلکہ اپنے مصالح اور مغربی طاقتوں کے چشم ابرو کا غلام تھا۔ یعنی مسئلہ خلافت جسکو کمال اتاترک نے اتحادیوں کے اشارہ اور خاص طور سے برطانیہ کے مشورہ اور ہدایت پر بیک جنبش لب یا گردش قلم ختم کر دیا۔ اور سارا عالم اسلام خاص طور پر ہندوستان کا مجروح ستم رسیدہ مسلمان دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا

(پرانے چراغ ص۱۵۱)

ہندو مسلم اتحاد کے خوفناک نتیجے

ترک ذبیحہ گاؤ، شدھی، سنگٹھن

حقائق وشواہد کی روشنی میں ہم پورے وثوق کیساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان تحریکات (تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، ہندو مسلم اتحاد) کیوجہ سے اور ان میں ہندوں کی نہ صرف شرکت وشمولیت بلکہ قیادت وسیادت کیوجہ سے برصغیر کے مسلمانوں کو انتہائی اندوہناک مصائب کا سامنا کرنا پڑا اور غم کی راتیں طویل سے طویل تر ہوتی چلی گئیں۔

ان عنوانات پر امام احمد رضا اور انکے رفقاء کرام (رحمہم اللہ تعالیٰ) کے نظریات کا ہم بعد میں ذکر کرینگے۔ پہلے آپ مؤرخین کی رائے ملاحظہ فرمائیں۔

جب مسلمان لیڈر خاموش تھے۔ ہندو لیڈر شدھی کے نام سے مسلمانوں کو مرتد اور سنگٹھن کے نام سے مسلمانوں کو زدوکوب کر رہے تھے۔ تو یہ کانگریسی لیڈر مہا سبھائیوں کے پشت پناہ تھے۔ انھوں نے برملا کبھی بھی مہا سبھائیت کے خلاف نہ احتجاج کیا نہ جدوجہد کی پھر جب ہندو مسلم فسادات شروع ہوئے

تو مسلمان لیڈر عامۃ المسلمین کو امن پسندی کی تلقین کیلئے میدان میں اُتر پڑے اور گاندھی جی نے کہا تو یہ کہ "ہندو بزدل ہیں اور مسلمان ذنگئی"
انھوں نے اور اُنکے ساتھیوں نے شردھانند کے خلاف ایک حرف نہ کہا۔ مالوی جی کی امن سوزی اور اشتعال انگیزی پر چپ سادھ لی مونجے، کیلکر، جیکر اور دوسرے آتش زیر پا ہندو لیڈروں کے مقابلے میں کبھی نہ آئے۔ بلکہ اگر کسی مسلمان نے انکے خلاف لب کشائی کی تو بپھر گئے، بگڑ گئے۔ امرتسر کے ایک جلسہ میں مولانا ظفر علی خاں نے پنڈت مدن موہن مالوی کی تفرقہ انگیزی اور فتنہ پروری کے خلاف کچھ کہدیا تو گاندھی جی جو صدر جلسہ تھے بگڑ گئے اور اُنھوں نے کہا۔ آپنے مالوی جی پر نکتہ چینی کر کے میرے سینے پر گھونسہ مار دیا۔ سوامی شردھانند کا حادثہ قتل جب واقع ہوا تو انکی روش کیخلاف کسی نے ایک حرف بھی نہ کہا۔ البتہ گاندھی جی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

(قائد اعظم محمد علی جناح اور انکا عہد ص۱۵ رئیس احمد جعفری)

غم واندوہ کی طویل داستان

"متحدہ قومیت" کے نتیجے میں مسلمانوں کی مسلسل پامالی، اور ہندوؤں کی مسلسل جارحیت مسلمان رہنماؤں کا مکمل سکوت ہندو لیڈروں کی خوں آشامی۔ کی داستان الم بڑی طویل ہے جو ان اوراق میں نہیں سما سکتی۔ جناب رئیس احمد تحریر فرماتے ہیں

مسلم قیادت اب بھی پر امید تھی۔ وہ ہندوستان کو میدان جنگ نہیں بنانا چاہتی تھی، اخوت اور اعتماد باہمی کی جنت بنانا چاہتی تھی وہ اشتعال کی رو میں بھی نہیں بلکہ افتراق کی آگ پر پانی بنکر گرتی اور اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتی رہی گاندھی جی کیطرف سے، کانگرس کے ہندو لیڈروں کیطرف سے شدھی کی سوامی کو۔ اور سنگٹھن کی مالوی جی کو پوری پوری آزادی حاصل تھی۔ کیا مجال ہے جو موتی لال اور جواہر لال جیسے "لامذہب" تک نے ان غلط کار ہم مذہبوں کو ٹوکا ہو تا البتہ مسلمانوں نے یہ کیا کہ مجلس خلافت نے ڈاکٹر کچلو کو خلافت

کمیٹی سے برطرف کردیا کیونکہ وہ تنظیم کے علمبردار تھے اور محمد علی نے خواجہ حسن نظامی کے خلاف میدان جنگ قائم کردیا کیونکہ وہ تبلیغ کے سپہ سالار تھے مسلم لیگ میں اگر کسی نے شدھی اور سنگٹھن کے خلاف لب کشائی کی تو مسٹر جناح شمشیر براں بن گئے۔ علی برادران اور جناح کی یہ روش اس لئے تھی کہ یہ اب تک ہندو مسلم اتحاد کے خواہاں اور جویا تھے

(قائداعظم اور انکا عہد ص۱۵۸)

شدھی کی تحریک

ہم بلاریب کہہ سکتے ہیں مسلمان قوم ایک جاندار قوم ہے ۱۸۵۷ء ہی سے نہیں بلکہ اُس سے بھی بہت پہلے سے ایک تسلسل کیساتھ کچلی اور پامالی کی جارہی تھی مگر اس کی جی داری اور جذبہ ایمانی ناقابل تسخیر تھی تحریک ہجرت وغیرہ کے عذاب ناصواب سے ابھی سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ گاندھی جی ان سے الگ ہو گئے اور ابھی حیرت بھی دور نہیں ہوئی تھی کہ تحریک شدھی جاری ہو گی۔

اس کے لیڈر سوامی شردھانند۔ (جنھیں دہلی کی جامع مسجد میں بٹھا کر وعظ کرایا جاتا تھا) لالہ لاجپت رائے۔ اور ڈاکٹر مونجے تھے۔ سیدھے سادے لفظوں اس کا مقصد یہ تھا کہ غیر ہندو کو ہر اُس تدبیر سے جو ممکن ہندو بنالیا جائے اور انھیں ہندو دھرم میں شامل کر لیا جائے۔ چنانچہ روزنامہ پرتاپ لاہور نے اس موضوع پر ایک مضمون شائع کیا جو ہم "تحریک پاکستان ص۱۶۲ سے نقل کرتے ہیں جس سے اس تحریک کی نوعیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اس ملک میں حکومت عددی اکثریت پر موقوف ہے اس لئے شدھی کی تحریک ہندوؤں کیلئے موت وحیات کا مسئلہ ہے اس ملک میں مسلمان ایک حقیر اقلیت سے سات کروڑ کی تعداد تک پہنچ چکے ہیں، عیسائی چالیس لاکھ ہیں اور ملک کے بائیس کروڑ ہندوان کی وجہ سے بے دست وپا ہو کر رہ گئے ہیں اگر انکی تعداد یوں ہی بڑھتی رہی تو نہ جانے کیا حشر ہوگا۔

شدھی کی تحریک بنیادی طور پر مذہبی تحریک ہے۔ مگر اس کے دوسرے مضمرات

نے عام ہندوؤں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ دوسروں کو بھی اپنے مذہب میں قبول کر لیں
(تحریک پاکستان صفحہ ۱۶۳-۱۶۴ پروفیسر محمد خلیل اللہ)

شنگٹھن یہ ایک نہایت خوفناک جارح تنظیم تھی اس کی تفصیل بھی جناب پروفیسر محمد خلیل اللہ صاحب سے سنئے۔

شدھی کیساتھ ساتھ ایک اور تحریک شنگھٹن شروع ہوئی جسکے بانی ڈاکٹر مونجے بتلائے جاتے ہیں۔ اس تحریک کا مقصد ہندو معاشرے کو ایک مربوط، منظم اور فعال معاشرے میں تبدیل کرنا تھا۔ ڈاکٹر مونجے نے اسکی اہمیت اور ماہیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

"جس طرح انگلستان انگریزوں کا ہے، فرانس فرانسیسیوں کا اور جرمنی جرمنوں کا اسیطرح ہندوستان ہندوؤں کا ہے اگر ہندو منظم ہو جائیں تو وہ انگریزوں اور انکے پٹھو مسلمانوں کو مغلوب کر سکتے ہیں ہندوؤں کو اپنی دنیا آپ پیدا کرنی ہے جو شدھی اور شنگھٹن کے سہارے پروان چڑھے گی۔

ان تحریکوں کے ایک اور سرگرم کارکن ہردیال نے تو ان عزائم کو بھی واضح کر دیا "شنگھٹن کی تحریک کا مقصد ہندوستان میں ایک مضبوط، متحد اور بیدار سیاسی جماعت کا قیام ہے جو ایک آزاد ہندو ملک کے قیام کیلئے مسلسل کوشش کریگی ہندو قومی مملکت کی بنیاد ہندو اداروں پر ہو گی۔ مثلاً سنسکرت زبان، ہندی زبان، ہندو تاریخ ہندو تہوار، ہندو سورماؤں کا احترام۔ ہندوؤں کے مقدس مقامات کا احترام اور ہندو تہذیب سے محبت وغیرہ

ہمارے درمیان ایسے لوگ بھی ہیں جو بلاوجہ آزادی ہند کی تحریک میں نیم عرب اور نیم ایرانی مسلمانوں کو بھی شامل کرنا چاہتے ہیں انھیں خبر نہیں کہ قومی مملکت اپنی قدیم قومی روایات اور اداروں کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ اور یہی عناصر مملکت کے باشندوں کو متحد کر سکتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمان تو محض ایک غیر متعلق اور غیر ضروری عنصر ہیں۔ انکا مستقبل بس یہی ہے

کہ وہ شدھی تحریک کے ذریعہ ہندو مذہب میں شامل ہو جائیں۔

(تحریک پاکستان ص۱۶۵ تا ص۱۶۶)

یہ تحریک ایک نیم فوجی تحریک تھی ہندوؤں کو باقاعدہ جنگ و جدال کی تربیت.... دی جاتی تھی۔ ملک کے گوشے گوشے اکھاڑے قائم کئے گئے تھے کشتی اور لٹھ بازی اور شورش برپا کرنے میں انھیں ماہر کیا جاتا تھا۔ ان دونوں تحریکوں نے مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

حتیٰ کہ اس وقت قائد اعظم اتحاد کے قائل ہونے کے باوجود یہ فرمانے پر مجبور ہو گئے جیسا کہ جناب رضی حیدر لکھتے ہیں

ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس مقصد کیلئے ضروری ہے کہ طرفین کے مابین دوستانہ اور پر خلوص جذبات کو فروغ دیا جائے۔ بدقسمتی سے حال ہی میں شدھی اور سنگٹھن کی تحریکوں کا دکشتی اور مسجدوں کے قریب باجے بجانے کے سوال پر جو فسادات ہوئے ہیں قابل مذمت ہیں ہر چند مسائل مستقل نوعیت کے ہیں لیکن ہم چاہتے ہیں کہ طرفین ان فسادات کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے جیو اور جینے دو کی پالیسی پر عمل کریں

(قائد اعظم کے بہتر سال ص۱۹۲)

انھیں حالات سے متاثر ہو کر ۱۹۲۵ء میں علی گڑھ میں منعقد ہونیوالے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے، جناب سر عبد الرحیم نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا:

ہندو مہا سبھا شدھی سنگٹھن کے علاوہ لالہ لاجپت رائے اور سوامی شردھانند ایسے سیاستدان بھی مسلمانوں پر حملہ کرنے سے باز نہیں آتے جسطرح سپین والوں نے مورس (مسلمانوں) کو اسپین سے نکال ڈالا اسی طرح مسلمانوں کو ہندوستان سے نکالنے چند ہندو لیڈروں نے بھی کھلم کھلا طور سے اعلان کر دیا ہے لیکن میرے ہندو دوستوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ مسلمان ان کے منہ سے کہیں

بڑا لقمہ ہیں۔

(قائد اعظم محمد علی جناح اور اُن کا عہد ص ۱۵۹)

محمد علی جوہر کی سوچ

بالآخر وہ دن بھی آگئے جب ہندو ذہنیت کا عفریت کھل کر سامنے آگیا اور اسلام کی محبت سے لبریز دل پاش پاش ہو گئے اور وہ لوگ جو ان تحریکات کے علمبردار تھے جنکی جرأت و استقلال کے سامنے پورے ہند کے ہندو "ادر توده ریگ" سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ جناب سید ابوالحسن علی ندوی مولانا محمد علی جوہر کے تذکرہ میں لکھتے ہیں

لیکن افسوس کہ جب ۱۹۲۳ء میں جب وہ آخری بار جیل سے باہر آئے تو انگریزی حکومت کی جسکی نمائندگی اسوقت ایک یہودی النسل وائسرائے لارڈ ریڈنگ کر رہا تھا سازش کامیاب ہو چکی تھی۔ ہندو مسلم اتحاد پارہ پارہ ہو چکا تھا شدھی سنگٹھن کی تحریک آندھی کیطرح چل رہی تھی۔ بڑے بڑے شہروں میں فرقہ وارانہ فسادات وبا کیطرح پھوٹ پڑے تھے۔ مولانا محمد علی نے اپنی اصلی سادگی اور مردانگی سے ان کی مذمت کی جو ایک مسلمان کا شیوہ اور ایک بہادر سپاہی کا مزاج ہے۔

لیکن ان کے زخمی دل کو اس سے بڑی چوٹ لگی کہ تحریک آزادی کے ہندو رہنماؤں نے (گاندھی جی کو مستثنیٰ کر کے) اس صاف دماغ اور کھلے دل سے ان فسادات کی مذمت اور اپنے فرقہ کے اس رُجحان پر تنقید نہیں کی اور وہ اسکے خلاف اسطرح صف آرا نہیں ہوئے جیسی وہ توقع رکھتے تھے۔

اسوقت مولانا محمد علی نے اسطرح سوچنا شروع کیا کہ شاید انکی قسمت انکے ہم خیال اور ہم مذہب لوگوں ہی سے وابستہ ہے اور رفتہ رفتہ انڈین نیشنل کانگرس سے مایوس ہوتے چلے گئے۔ اور انہوں نے اپنی سرگرمیوں کا میدان مسلمانوں کو بنا لیا

(پرانے چراغ ص ۱۵)

یہ تھے مولانا محمد علی جوہر مرحوم جنکی ہر ادا جذب و محبت سے لبریز تھی۔

انسان طبعاً کچھ لوگوں کو پسند اور کچھ لوگوں کو ناپسند کرتا ہے۔ اور یہ پسندی کسی فلسفہ کے تابع نہیں ہوتی زمانہ طالب علمی ہی سے محمد علی جوہر ہم سب ساتھیوں کو بیحد پسند تھے۔ اُس وقت بچہ بچہ کی زبان پر یہ شعر ہوتا تھا ۔ ؎

بولیں اماں محمد علی کی　　　جان بیٹا خلافت پہ دیدو

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ

سیاست را نقاب چہرہ کردی　　　دگر نہ عاشق مستانہ بودی

رسیدی از رہ اغیار تا یار　　　عجب مستے عجب دیوانہ بودی

اور یہ تعجب ہے کہ اسوقت جب ہم لوگوں کو "باشعور" نہیں کہا جا سکتا تھا جوہر جتنا ہی پسند تھے ابوالکلام آزاد اُتنے ہی ناپسند کیے جاتے تھے۔ غور و خوض کے بعد اب یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مولانا جوہر جتنے مخلص تھے ابوالکلام آزاد اُتنے ہی مفاد پرست تھے۔ واللہ اعلم

علی برادران کی واپسی

تاریخ شاہد ہے کہ علی برادران (مولانا شوکت علی مولانا محمد علی) اپنے تمامتر اخلاص کے باوجود ہندؤں کیا تھ نہ رہ سکے اسلام کی کشش اور مسلمانوں کی محبت انھیں واپسی اپنوں میں لے آئی۔ اس باب میں محترم پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب نے اپنی کتاب "تحریک آزادی ہند اور السواد الاعظم" میں تفصیل سے گفتگو فرمائی ہے خصوصاً اُنہوں نے اس موقع پر حضرت شاہ علی حسین اشرفی کے خلیفہ طریقت صدر الافاضل حضرت مولانا نعیم الدین صاحب علیہ الرحمہ کا ذکر فرمایا ہے کہ ۱۹۲۰ء کے فوراً بعد ہی صدر الافاضل نے مولانا جوہر سے بات چیت شروع کردی تھی۔ اس سلسلہ میں حضرت صدر الافاضل دہلی بھی مولانا کے پاس گئے تھے اور انھیں تمام شرعی اور سیاسی صورت حال سے آگاہ کیا تھا اور مولانا نے ہندؤں سے الگ ہونیکا وعدہ بھی فرمایا چنانچہ

> ۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کیلئے لندن جانے سے قبل مولانا محمد علی جوہر صدر الافاضل سے ملنے آئے صدر الافاضل نے پھر ہندو مسلم اتحاد کے نتائج و عواقب کیطرف انکو متوجہ کیا۔ اس پر اُنہوں نے فرمایا "اگر زندہ رہا تو اس کی تلافی کی کوشش کروں گا"

مولانا شوکت علی خود مراد آباد جاکر صدر الافاضل کے دولت کدے پر حاضر ہوئے اور اُن کے سامنے ہندو مسلم اتحاد کی حمایت و تائید سے دست کش ہوئے (تحریک آزادی ہند اور السواد الاعظم ص ۵۲)

علمائے اہلسنت کا کردار

حق یہ ہے کہ اس پر آشوب دور میں علمائے اہلسنت سیاسی جوڑ توڑ سے تقریباً الگ ہی رہے تحریکیں اُٹھتی تھیں اور بگولوں کیطرح پوری قوم کی آنکھوں میں مٹی ڈالتی ہوئی گذر جاتی تھیں۔ شعلے لپکتے تھے اور گاؤں کے گاؤں خاکستر ہو جاتے تھے۔ تلواریں چمکتی تھیں اور چپہ چپہ لہو میں ڈوب جاتا تھا۔ علمائے حق علماء اہلسنت آواز بلند کرتے جنھیں بے حقیقت قرار دیا جاتا۔

شدھی، شنگٹھن، ترک ذبیحہ گاؤ کی تحریکیں جاری تھیں مسلمان شنگٹھن کے کا شکار ہو رہے تھے۔ اور رہنمایاں قوم صبر و ثبات کی تلقین فرما رہے تھے۔ عین اسوقت علمائے اہلسنت نے جو کارنامے انجام دیے آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہیں یہاں میں (تحریک آزادی ہند اور السواد الاعظم سے) چند اقتباس نقل کرتا ہوں جو حالات و واقعات کی وضاحت کیلئے کافی ہیں۔ محترم پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں

> تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات کے بعد تحریک شدھی نے شدت اختیار کی جس میں راجہ سے لیکر پرجا تک سب شریک تھے ۱۹۲۵ء میں آریہ سماج کے بانی دیانند کی صد سالہ تقریب کے موقع پر ایک جلسہ میں ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے ہندو لیڈر جمع ہوئے اور وہاں مسلمانوں کو مرتد و گمراہ کرنیکی ایک خفیہ سازش تیار کی گئی۔ ارتداد کی اس تحریک نے مسلمانان ہند میں ایک اضطراب پیدا کر دیا علمائے حق نے اس کی پوری پوری مزاحمت فرمائی جن میں یہ حضرات قابل ذکر ہیں۔ • حضرت مولانا شاہ حامد رضا خان صاحب • حضرت پیر جماعت علی شاہ صاحب • حضرت مولانا مفتی مصطفیٰ رضا خان صاحب • مولانا غلام قطب الدین اشرفی برہمچاری

• مولانا احمد مختار صدیقی صاحب میرٹھی • مولانا ابو البرکات سید احمد صاحب وغیرہ وغیرہ

• ۱۹۲۲ء میں تحریک شدھی چلی جس میں سوامی شردھانند، پنڈت کالی چرن، پنڈت رام چندر را، دھرم بھکشو لکھوی وغیرہ نے بھرپور حصہ لیا۔ اسکے مقابلہ کیلئے بریلی سے رد جماعت رضائے مصطفیٰ، میدان عمل میں آئی۔ اسکے بعد جماعت اشرفیہ حلقہ اشاعت الحق اور انجمن خدام الصوفیہ صدر الافاضل اور تاج العلما کے شیخ طریقت حضرت شاہ علی حسین اشرفی علیہ الرحمہ نے باوجود کبر سنی تحریک شدھی کا پوری قوت سے مقابلہ کیا۔ براہِ راست تبلیغ کے علاوہ مندرجہ ذیل طریقے بھی اختیار کئے گئے۔

• معالج حیوانات کے بھیس بدل کر • وید حکیم کا بھیس بدل کر • گانے والے طائفہ کا بھیس بدل کر • سادھوؤں کا بھیس بدل کر •

مولانا سید قطب الدین برہمچاری اور انکے شاگرد غلام قادر اشرفی نے بھیس بدل کر نہ صرف مرتدین کو مشرف باسلام کیا بلکہ بہت سے ہندوؤں کو حلقہ بگوش اسلام کیا مجموعہ طور پر ساڑھے چار لاکھ مرتد مسلمان ہوئے اور ڈیڑھ لاکھ ہندوؤں نے اسلام قبول کیا۔ بھیس بدل کر جو اشاعتِ اسلام کی کوشش کی اس سے پچاس ہزار ہندو مسلمان ہوئے۔

مسلمان ہونے پر جو سند جاری کیجاتی تھی اسکے چار حصے ہوتے تھے۔ ایک اسلام قبول کرنیوالے کو دیا جاتا۔ دوسرا صدر دفتر بھیجا جاتا تیسرا ریکارڈ میں محفوظ کیا جاتا۔ اور چوتھے پر نو مسلم کی چوٹی کاٹ کر لگائی جاتی

(تحریک آزادی ہند اور السواد الاعظم ص ۱۲۶ تا ۱۲۸)

جاں نثاران اسلام

"ہر فرعونے را موسیٰ" یہ ضرب المثل ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار ناممکن ہے اندھیروں کی کوکھ سے روشنی پھوٹتی ہے۔ رات کی تاریکیوں کے دامن سے لپٹی ہوئی صبح نمودار ہوتی ہے۔ ہندوستان کی کوکھ نے جہاں شردھانند کو پیدا کیا۔ راجپال کو پیدا کیا۔ بھولا ناتھ، پالا مل نتھو رام کو

پیدا کیا وہیں اُسی سرزمین نے قاضی عبدالرشید، غازی علم الدین، عبداللہ اور امیر احمد محمد صدیق غازی عبدالقیوم کو بھی پیدا کیا۔

تحریک شدھی کی ناکامی اور سنگٹھن کی شکست کے بعد ہندوؤں نے اسلام اور رسول اکرم کی شان میں علی الاعلان گستاخیاں شروع کر دیں اور گستاخیوں سے لبریز کتابوں، کتابچوں رسالو اور اشتہاروں کا ایک سیلاب امنڈ آیا اور پھر غیرت مند مسلمانوں نے اس کا بھرپور محاسبہ کیا۔

چنانچہ شردھانند کو قاضی عبدالرشید نے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ راجپال کو غازی علم الدین نے جہنم رسید کر دیا۔ بھولا ناتھ سین کو عبداللہ اور امیر احمد نے فنا کر دیا۔ بدلا مل کو محمد صدیق نے قتل کر دیا اور کراچی کے نتھو رام کو غازی عبدالقیوم نے دوزخ میں بھیجدیا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

کردار کی ایک اور جھلک

انھیں ایام میں جب تاریکیوں کی یورش تھی اور باغیرت مسلمان مشرکین کے ہر حملہ اور ہر یلغار کیلئے سینہ سپر تھے اور ہنستے، مسکراتے تختۂ دار پر چڑھ جاتے کچھ علماء، کچھ مفتی اور رہنمایان دین و ملت ایسے بھی تھے جو ہندوؤں کی محبت میں ان شہیدوں کو جنت کی بو سے بھی محروم فرما رہے تھے۔ چنانچہ

> جمعیۃ العلماء ہند کے صدر مفتی محمد کفایت اللہ نے شردھانند کے قاتل غازی عبدالرشید کیلئے فتویٰ دیا کہ وہ جنت سے محروم ہے۔ انھوں نے فرمایا در کافر معاہد کا قاتل جنت کی بو بھی نہ سونگھے گا ص۲۲۵ . . . .
>
> اسی طرح جب راجپال نے اپنی کتاب رنگیلا رسول شائع کی اور مسلمانوں کے احتجاج پر اسکے خلاف مقدمہ چلا اور عدالت عالیہ پنجاب نے اس کی بری کر دیا . . . . تو پھر جب پنجاب کے ایک نوجوان غازی علم الدین نے اسکو قتل کیا تو ۔ ابھی مقدمہ زیر سماعت تھا لیکن قوم پرست پریس نے علم الدین کو مرتکب جرم قرار دیا اور اس فعل کو بزدلانہ قرار دیا

(تحریک آزادی ہند اور السواد الاعظم ص۲۳۶)

مسئلہ ذبیحہ گاؤ

اس باب کو میں جناب ”پروفیسر محمد خلیل اللہ“ صاحب کی کتاب ”تحریک پاکستان کے اس اقتباس سے شروع کرتا ہوں کہ

ذبیحہ گاؤ کی مخالفت مسلمانوں کے خلاف ایک اور موثر ہتھیار بنی اس سلسلے میں ایک بات قابل ذکر ہے۔ جہاں تک گائے کا گوشت کھانیکا تعلق ہے مسلمان اور انگریز برابر ہیں۔ چنانچہ انگریز چھاؤنیوں میں برابر گاؤ کشی ہوتی تھی مگر برطانوی حکومت کے دور کی ساری تاریخ میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا۔ جہاں گاؤ پرست ہندوؤں نے انگریزوں کے خلاف اس ضمن میں کوئی مظاہرہ اور احتجاج کیا ہو۔ مگر اسی سوال پر مسلمانوں کے خلاف بالالتزام فساد برپا کیے گئے

(تحریک پاکستان ص۱۶۵)

تحریک ترک ذبیحہ گاؤ بھی منجملہ دیگر وباؤں کے ایک وبا تھی اور اسے شعائر اسلام مٹانیکی نہایت خوفناک سازش کہا جائے تو کچھ غلط بات نہیں ہوگی۔ اسوقت اس مسئلہ کو نہایت سادگی سے پیش کیا جاتا تھا۔ کہ کیا گائے کی قربانی ہی ضروری ہے کیا اسکے بجائے دوسرے جانور مثلاً اونٹ، دنبہ، بکری، بھینس وغیرہ کی قربانی نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ مسئلہ کے لحاظ سے گائے کی ہی قربانی ضروری نہیں دوسرے جانور بھی کیے جا سکتے ہیں ۔ جواب میں یہ کہا جاتا کہ ”پھر آپ اپنے ہندو بھائیوں کا دل نہ دکھائیں“ گائے کے بجائے کوئی اور جانور کر لیا کریں۔

حیرت تو یہ ہے کہ اسکے عواقب و انجام شاذ و نادر ہی لوگ سمجھ پائے اور اکثریت اسی ڈگر پر چل نکلی کہ واقعی کیا ضروری ہے کہ گائے کی ہی قربانی کیجائے۔ چنانچہ بہت بڑے بڑے قد آور لوگوں نے ”ترک ذبیحہ گاؤ“ کے متعلق بیانات داغ دئیے۔ اور جب امام احمد رضا علیہ الرحمہ اور انکے رفقاء نے صحیح صورت حال اور صورت مسئلہ کی وضاحت کی تو انھیں متعصب و فتنہ انگیز کہا گیا

رہنمایان قوم کے بیانات

اس ضمن میں ہم پہلے شاہ افغانستان امان اللہ خاں کا بیان پیش کرتے ہیں جنکے اجداد اور جنکے ملک کے

باجبروت حکمرانوں سے بھارت کی وسیع سرزمین تھراتی تھی۔ پروفیسر محمد مسعود صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

> شاہ افغانستان امان اللہ خاں سیاحت یورپ کے دوران ہندوستان سے گذرے تو بمبئی میں جمعہ کی نماز کی امامت فرمائی اور خطبۂ جمعہ میں فرمایا۔ نہایت درجہ شرم کی بات ہے کہ ہندوستان کے مسلمان گائے کے سوال پر ہندوؤں کے جذبات کی عزت نہیں کرسکتے۔
>
> (تحریک آزادی ہند ص ۲۲۸)

اسی طرح جناب حکیم اجمل صاحب۔ جناب مولانا عبدالباری صاحب۔ جناب مولانا ابوالکلام آزاد صاحب۔ جناب خواجہ حسن نظامی صاحب۔ اور دیگر کانگریس کے مفتی صاحبان نے یہ فتویٰ دیا کہ گائے کی قربانی ضروری نہیں۔ ہندوؤں کی دلجوئی کیلئے گائے کی قربانی بند کردی جائے۔ اور جب یہ سب لوگ بولیں تو جمعیت العلماء ہند کیسے خاموش رہ سکتی ہے۔

> "ہندو مسلم اتحاد کے نام پر جمعیۃ العلماء ہند اپنے اجلاس ۱۹۲۱ء میں یہ قرارداد منظور کرتی ہے "مسئلہ گاؤکشی کے بارے میں ہندوؤں کی دلجوئی کیلئے مسلمان گائے کے بجائے بھیڑ بکری کی قربانی دیا کریں۔
>
> (تجلیات عثمانی)

انھیں ایام میں ہندنیتا اور ہندوؤں کے یہ سازشی لیڈر مسلسل جال پھیلارہے تھے اور مسلمانوں پر گرفت مضبوط سے مضبوط تر کرتے چلے جارہے تھے۔

برادران وطن کا نظریہ

دیکھنا یہ ہے کہ جب مسلمان علماء، مسلمان مفتی، مسلمان لیڈر برادران وطن یعنی ہندوؤں کی دلجوئی میں اتنے آگے بڑھ گئے تھے جہاں تک جانیکا تصور بھی ناممکن نظر آتا ہے اسوقت ہندو رہنما کیا سوچ رہے تھے بلکہ علی الاعلان کیا کہہ رہے تھے۔ کانگریس کے جنرل سکریٹری اچاریہ کرپلانی کہتے ہیں

> گاندھی جی نے کانگرس کو بتایا کہ ہمارا کام صرف یہ نہیں کہ سیاسی باگ ڈور انگریز کے ہاتھ سے چھین کر اہل ملک کے ہاتھ میں دیدیں بلکہ سب سے ضروری ہے

کہ ہم تمام جدوجہد کی بنیاد کسی ایسے فلسفہ حیات پر رکھیں جسکے دائرے میں ہماری معاشرت، اخلاق اور روحانیت سب داخل ہو۔ . . . .

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ کانگریس کی ہر اسکیم گاندھی جی کے فلسفے کے ماتحت چلائی جائیگی یہ ہرگز ممکن نہیں کہ آپ کسی اسکیم اور کسی اور فلسفۂ زندگی کے اصول پر چلا سکیں۔

کانگریسی اسکیموں کا قلم کسی اور فلسفہ پر نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ فلسفہ زندگی دنیا کے کسی اور فلسفۂ زندگی کے ماتحت نہیں بنایا جا سکتا۔

گاندھی کا فلسفہ زندگی ایک ایسا مکمل فلسفہ ہے جس سے اجتماعاً قوم بھی صحیح رہبری حاصل کر سکتی ہے اور فرداً فرداً اشخاص بھی اس سے سیدھا راستہ پا سکتے ہیں۔

(تحریک آزادی ہند ص ۹ بحوالہ اخبار مدینہ بجنور، ۱ اگست ۱۹۳۹ء)

اسی طرح مسٹر کستور آپٹے کہتے ہیں

"مسلمانوں کو اگر ہندوستان میں رہنا ہے تو انھیں ہندو بن کر رہنا ہے اور ہندو تہذیب و تمدن کو اپنانا ہوگا۔"

مسٹر گو الگر کہتے ہیں

"ہندوستان میں رہتے والے غیر ہندو افراد کو ہندو تہذیب اور زبان کو اپنا لینا چاہیے"

(ماخوذ تحریک آزادی ہند اور السواد الاعظم)

سیدنا امام احمد رضا علیہ الرحمہ و مسئلہ ذبیحہ گاؤ

علامہ اقبال کی رائے اور انکی وصیت

اس باب کو ہم "اوراق گم گشتہ" مولفہ "رحیم بخش شاہین ایم اے" کے ایک اقتباس سے شروع کرتے ہیں۔ زیر نظر کتاب "اوراق گم گشتہ" حضرت علامہ اقبال کی غیر مدون تحریروں پر مشتمل ہے حضرت علامہ امام احمد رضا علیہ الرحمہ کے متعلق لکھتے ہیں

> ہندوستان کے دورِ آخر میں ان جیسا طبّاع اور ذہین فقیہ پیدا نہیں ہوا میں نے ان کے فتاوی کے مطالعہ سے یہ رائے قائم کی ہے۔ اور اُن کے فتاویٰ انکی ذہانت، فطانت، جودتِ طبع، کمالِ فقاہت اور علوم دینیہ میں تبحر علمی کے شاہد عادل ہیں
>
> مولانا ایک دفعہ جو رائے قائم کر لیتے ہیں۔ اس پر مضبوطی سے قائم رہتے ہیں یقیناً وہ اپنی رائے کا اظہار بہت غور و فکر کے بعد کرتے ہیں۔ لہذا انھیں اپنے شرعی فیصلوں اور فتاویٰ میں کبھی کسی تبدیلی یا رجوع کی ضرورت نہیں پڑتی۔
>
> با ایں ہمہ انکی طبیعت میں شدت زیادہ تھی۔ اگر یہ چیز درمیان میں نہ ہوتی تو مولانا احمد رضا خاں گویا اپنے دور کے امام ابو حنیفہ ہوتے
>
> (اوراق گم گشتہ ص ۱۸۵)

یہاں جی چاہتا ہے کہ حکیم ملت علامہ اقبال کی آخری وصیت کا آخری جز و یہ بھی درج کر دیا جائے جو انہوں نے جناب جاوید اقبال کیلئے تحریر کیا تھا۔

اگرچہ موضوع کے اعتبار سے اس اقتباس کی ضرورت نہیں، پھر بھی اس سے علامہ اقبال کے عقائد و نظریات کی بھرپور وضاحت ہو جاتی ہے۔ اور گمان ہوتا ہے کہ امام احمد رضا کے فتاویٰ کے گہرے مطالعہ کے بعد انکے ایقان میں نہایت درجہ کی تابندگی ہوئی ہو۔

علامہ اقبال پر ایک دور ایسا بھی گذرا ہے جبکہ وہ فقہ کی تدوین کے متعلق بڑے انہماک سے

سوچ رہے تھے اور اسکے متعلق تقریباً تمام ضروریات و لوازمات کو بھی فراہم کرلیا تھا مگر بیماری اور عمر وفا نہ کرسکی۔ لہٰذا ان حالات میں ضروری تھا کہ حضرت علامہ فقہا، فقہ اور تاریخ فقہ سے واقف ہوتے۔ اور میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ کوئی فقیہ (غیر متعصب) امام احمد رضا اور انکی کتابوں سے اعراض نہیں کرسکتا۔

مسلک اہلسنت اور اہل بیت سے محبت

بات تھی علامہ اقبال علیہ الرحمہ کی وصیت کی جو انہوں نے جاوید اقبال کیلئے رقم فرمائی تھی۔ تحریر فرماتے ہیں۔

> باقی دینی معاملے میں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ میں اپنے عقائد میں بعض جزوی مسائل کے سوا جو ارکان دین سے نہیں ہیں سلف صالحین کا پیرو ہوں۔ اور یہی راہ بعد کامل تحقیق کے محفوظ معلوم ہوتی ہے جاوید کو بھی میرا یہی مشورہ ہے کہ وہ اسی راہ پر گامزن رہے، اور اس بدقسمت ملک ہندوستان میں مسلمانوں کی غلامی نے جو اپنے عقائد کے نئے فرقے مختص کرلئے ہیں ان سے احتراز کرے۔ بعض فرقوں کیطرف لوگ اسواسطے مائل ہوجاتے ہیں کہ ان فرقوں کیساتھ تعلق پیدا کرنے سے دنیوی فائدہ ہے
>
> میرے خیال میں بڑا بدبخت ہے وہ انسان جو صحیح دینی عقائد کو مادی منافع کی خاطر قربان کردے غرض یہ ہے کہ "طریقہ حضرات اہلسنت محفوظ ہے" اور اسی پر گامزن رہنا چاہیئے اور ائمہ اہل بیت کیساتھ محبت اور عقیدت رکھنی چاہیئے۔
>
> محمد اقبال ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۵ء
>
> (اوراق گم گشتہ ص ۲۶۶)

نوا را تلخ تر می زن

ہے قہاری و جباری و قدوسی و جبروت۔ یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان حضرت علامہ نے "امام احمد رضا علیہ الرحمہ" کی شدت کا ذکر کیا ہے ممکن ہے حضرت علامہ کے نزدیک اُن کا ارشاد صحیح ہو۔ مگر خود ہی تو فرمانے ہیں۔

ع نوا را تلخ تر می زن چوں ذوق نغمہ کم یابی

اگر غور وفکر سے کام لیا جائے تو امام احمد رضا کی "شدت" بالکل نوائی بلا وجہ نہیں تھی۔ بلکہ اسوقت انتہائی ضروری تھی۔ وہ دور انتہائی خود رائی، خود فراموشی بلکہ خود فروشی کا دور تھا۔ دور جدید کی یلغار نے بڑے بڑے علمائے دین کہلانیوالوں کا رخ موڑ دیا تھا۔

خود فریبی کے اس دور میں لوگ دین اور اہل دین، اسلام اور اہل اسلام کا کھلے بندوں مذاق اڑانے لگے تھے شیخ اور علامہ کہلانیوالوں کے قلم اور ذہن بہک رہے تھے۔ حتیٰ کہ قرآن عظیم کی تفسیر وتعبیر بھی وقتی مصالح اور سیاسی رجحان کے تحت کیجا رہی تھی اور اس باب میں سر سید، مولانا شبلی سب سے آگے آگے تھے۔

پھر کچھ علمار کا ایک ایسا طبقہ بھی تھا جس نے عظمت مصطفیٰ اور عصمت حبیب کبریا کو پامال کرنیکی کوشش جدوجہد کی۔ ان حالات میں یقیناً امام احمد رضا کیلئے وہی درست تھا جو انھوں نے کیا۔

اگر موقع پرستی، مصلحت اندیشی اور چشم پوشی سے کام لیا جاتا تو ممکن ہے اسوقت ساری ملت ہی فرنگی اور برہمنی نظریات قبول کر چکی ہوتی اور نہ جانے کیا کیا رونما ہو چکا ہوتا۔

اور پھر یہ کہ حضرت علامہ ہی کے قول کے مطابق "عشق مصلحت اندیش نہیں ہوتا"، لہٰذا عشق نے مصلحت اندیشی سے کام نہیں لیا۔ امام احمد رضا کا دوسرا نام اگر عشق کہا جائے۔ تو عین درست ہوگا۔

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں۔

یا۔ ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

بے پناہ جرأت کا مظاہرہ

گاؤکشی کے معاملہ میں بھی امام احمد رضا علیہ الرحمہ نے نہایت جرأت وجواں مردی کا مظاہرہ فرمایا ہے جبکہ علمائے کرام کا ایک پورا طبقہ ہی نہیں ہندو اکثریت کی پوری قوت بھی شعائر اللہ کو مٹانے پر کمربستہ تھی۔ ان حالات میں کسی وقت بھی ہندو اپنے برادران وطن سمیت حملہ آور ہو سکتے تھے۔ اور ملک کے دوسرے حصوں کیطرح یہاں بھی آگ وخون کا کھیل شروع کر دیا جاتا مسلمانوں کو ذبح کر دیا جاتا اور انکے گھروں کو آگ لگا دی جاتی مگر آپ اور آپ کے رفقاء نے بے پناہ

جرأت ایمانی کا مظاہرہ فرمایا اور اپنوں کی دبی دبی غراہٹوں اور ہندوؤں کی دہکتی آنکھوں کی کوئی پرواہ نہیں کی اور کسی قسم کی کوئی مصلحت سدراہ نہ ہوسکی اور وہی کہا جو حق تھا۔

۱۲۹۸ھ میں ایک چھوٹی سی کتاب "انفس الفکر فی قربان البقر" رقم فرمائی جس میں نہایت عمدہ طریقہ سے ذبیحہ گاؤ کو ثابت فرمایا۔ بلکہ بلاوجہ روکنے پر اشرف اسلام کی اہانت وتذلیل کو مدنظر رکھتے ہوئے (گاؤکشی کو) واجب اور ضروری قرار دیا۔

اور ان علماء کی سخت تردید فرمائی جو گاندھی جی کی ہاں میں ہاں ملاتے اور برادران وطن کے نام پر ہندؤں کی دلجوئی کرنے کیوجہ سے اسلام کی اہانت اور شوکت اسلام کو پامال کرنے کے درپے تھے۔

اس کتاب میں امام احمد رضا نے نہایت باریک بینی سے اس مسئلہ کا جائزہ لیا ہے اور گاؤکشی کے ترک سے جس دینی، معاشی اور اقتصادی مسائل پیدا ہونیکا امکان تھا اُن کا بالوضاحت ذکر فرمایا ہے۔

خلاصہ کلام | آپ فرماتے ہیں

(۱) تو اب اصل مسئلہ کا جواب لیجئے۔ گاؤکشی اگرچہ بتخصیص اپنے نفس ذات کے لحاظ سے واجب نہیں۔ نہ اسکا تارک باوجود اعتقاد اباحت بنظر نفس ذات فعل گنہگار۔ نہ ہماری شریعت میں کسی خاص شئے کا کھانا بالیقین فرض مگر ان وجوہ سے صرف اسقدر ثابت ہوا کہ گاؤکشی جاری رکھنا واجب لعینہٖ اور اس کا ترک حرام لعینہٖ نہیں۔ یعنی انکے نفس ذات میں کوئی امر انکے واجب یا حرام کرنیکا مقتضی نہیں۔

لیکن ہمارے احکام مذہبی صرف اسی قسم کے واجبات ومحرمات میں منحصر نہیں۔ بلکہ جیسا ان واجبات کا کرنا۔ اور ان محرمات سے بچنا ضروری وحتمی ہے ـــــ یونہیں واجبات ومحرمات لغیرہا میں بھی امتثال واجتناب اشد ضروری ہے ـــــ جس سے ہم مسلمانوں کو کسی طرح مفر نہیں

اور ان سے بالجبر باز رکھنے میں بیشک ہماری مذہبی توہین ہے جسے حکام وقت بھی روا نہیں رکھتے ـــــ ہم ہر مذہب وملت کے عقلاء سے دریافت کرتے ہیں کہ

اگر کسی شہر میں بزور مخالفین گاؤ کشی قطعاً بند کردی جائے اور بلحاظ ناراضی ہنود اس فعل کو، کہ ہماری شرع ہرگز اس سے باز رہنے کا ہمیں حکم نہیں دیتی یک قلم موقوف کیا جائے تو کیا اس میں ذلت اسلام متصور نہ ہوگی! کیا اس میں خواری و مغلوبی مسلمین نہ سمجھی جائے گی؟ - کیا اس وجہ سے ہنود کو ہم پر گردنیں دراز کرنے - اور اپنی چہرہ دستی پر اعلیٰ درجہ کی خوشی ظاہر کرکے ہمارے مذہب اور اہل مذہب کیساتھ شماتت کا موقع ہاتھ نہ آئیگا؟ . . . . . . ہم پوچھتے ہیں کہ اس رسم سے جس میں صدہا منافع ہیں یک قلم امتناع آخر کسی وجہ پر مبنی ہوگا. اور وجہ سوا اسکے کچھ نہیں کہ ہنود کی ہٹ پوری کرنا اور مسلمانوں نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام انسانوں کے اسباب معیشت میں کمی یا تنگی کر دینا ہے . . . . اور اس میں ہمارے لئے ہزاروں منافع . . . .

(۲) مع ہذا گائے کی کھال وغیرہ سے جو ہزارہا قسم کے منافع ملتے اور ان منفعتوں میں ہنود بھی ہمارے شریک ہوتے ہیں اور چند اقوام کی تجارتیں اور انکے رزق کے ظاہری سامان اسی گاؤ کشی کا نتیجہ ہیں تو سائل کا یہ قول کہ کوئی فائدہ اس فعل پر مرتب نہ ہو محض تصور غلط ہے اور اس کی قربانی خاص ہمارے شعائر دین سے ہے . . . . وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ (اور اونٹ اور گائے کو کیا ہم نے تمہارے لئے خدا کے شعاروں میں سے)

(۳) اور یقیناً معلوم کہ ہمارے ملک میں اونٹ ہماری غذا و ادائے واجب قربانی کیلئے کفایت نہیں کرسکتے. اول تو سخت گراں دوسرے نسبت گاؤ نہایت قلیل الوجود. اور اگر گاؤ کشی موقوف کرکے اونٹ پر اکتفا کیجائے تو چند روز میں اونٹ کی قیمت دہ چند ہو جائے گی اور یہ نفع عام جو ہمارے غربا کو پہنچتا ہے ہرگز متصور نہ رہے گا اور عجیب نہیں کہ رفتہ رفتہ بوجہ قلت اونٹ حکم عنقا کا پیدا کرے

(۴) علاوہ بریں ہم دریافت کرتے ہیں اس کی تحریم ہنود کے یہاں دو ہی وجہ سے معقول ایک یہ کہ جانور کی ناحق ایذا اور ہتھیا ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ اکثر اقوام ہنود بکری، مرغی، مچھلی کھاتے ہیں کیا وہ جانور نہیں! کیا انکی جان۔ جان نہیں کیا اُن کی ایذا احرام نہیں۔ کیا اُن کا قتل ہتھیا نہیں۔

اور خود کتب ہنود سے جو رام و لچھمن و کرشن کا شکاری ہونا ثابت اس ہتھیا کا کیا

علاج ہے! اور ایسا ہی ناراضی ہنود کا خیال کیجئے تو اگر وہ اس ہتھیا کے حکم کو عام کردیں تو کیا شرع مطہر ہمیں ہر جانور کے ذبح و قتل سے باز رکھے گی۔!

اور سانپ کہ انسان کی جان کا دشمن اور ہندؤں کا دیوتا ہے ہرگز نہ مارا جائے گا۔۔۔۔

(۵) ایک وجہ یہ بھی ہے کہ گائے اُنکے یہاں معظم ہے اور اپنے معظم کا ہلاک نہیں چاہتے ہم کہتے ہیں اولاً گئو ماتا کی آنکھیں بند ہوتے ہی ان سعادت مندوں کی تعظیم کا حال کھل جاتا ہے۔ اپنے ہاتھوں چماروں کے حوالے کرتے ہیں کہ چیریں پھاڑیں۔ اور چرسا اپنے لئے ٹھہرا لیتے ہیں کہ کھال کی جوتیاں بنا کر پہنیں۔۔۔۔۔ اگر تعظیم ہے تو صرف گائے پر مقتصر ہے ہم بچشم خود دیکھتے ہیں کہ ہنود آپ بیل کی ہرگز تعظیم نہیں کرتے بلکہ اُس پر سخت تشدد کرتے ہیں

(۶) باقی رہا سائل کا یہ کہنا کہ اس فعل کے ارتکاب سے توران فتنۂ وفساد ہوگا) ـــــ ہم کہتے ہیں جن مواقع پر (مثل بازار وشارع عام وغیرہما) گاؤکشی کی قانوناً ممانعت ہے وہاں جو مسلمان گائے ذبح کریگا البتہ اثارت فتنہ وفساد اُس کی طرف منسوب ہو سکتی ہے۔ اور وہ قانوناً مجرم قرار پائے گا۔ اور اس امر کو ہماری شرع مطہر بھی روا نہیں رکھتی کہ ایسی وجہ سے مسلمانوں پر مواخذے یا اُنھیں سزا ہوئے۔۔۔۔ اور جہاں قانوناً ممانعت نہیں وہاں اگر توران فتنہ وفساد ہوگا تو لاجرم ہنود کیطرف سے ہوگا۔ اور جرم اُنھیں کا ہے کہ جہاں ذبح کرنیکی اجازت ہے وہاں بھی ذبح نہیں کرنے دیتے۔

(۷) بالجملہ خلاصہ جواب یہ ہے کہ بازار و شارع عام میں جہاں قانوناً ممانعت ہے براہِ جہالت ذبح گاؤ کا مرتکب ہونا بیشک مسلمانوں کی توہین و ذلت کیلئے پیش کرنا ہے کہ شرعاً حرام ہے۔ اور اسکے سوا جہاں ممانعت نہیں وہاں سے بھی باز رہنا اور ہنود کی بیجا ہٹ بجا رکھنے کیلئے ایک قلم اس رسم کو اٹھا دینا ہرگز جائز نہیں۔

اسکے ساتھ ہی دلائل و براہین کا دریا بہتا ہوا نظر آتا ہے قرآن واحادیث حکما اور فقہائے اسلام کے ارشادات سے گاؤکشی کو جائز اور بوجہ دیگر ضرور قرار دیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ہندوؤں کی مذہبی کتاب وید سے بھی قربانی گاؤ کا ثبوت دیا گیا ہے۔ غرض کردوں کہ صرف امام احمد رضا علیہ الرحمہ کی کتاب پڑھ کر ہی صحیح رائے قائم کیجا سکتی ہے

مرشدی صدر الشریعہ

امجد علی کو درس نظامی کے تمام فنون میں کافی دسترس حاصل ہے اور فقہ میں تو اُن کا پایہ بہت بلند ہے ـــــ آپ یہاں کے موجودین میں تفقہ جسکا نام ہے وہ مولوی امجد علی صاحب میں زیادہ پائیگا اسکی وجہ یہی ہے کہ وہ استفتاء سنایا کرتے ہیں ـــــ اور جو میں جواب دیتا ہوں لکھتے ہیں طبیعت اخاذ ہے طرز سے واقفیت ہو چلی ہے (امام احمد رضا علیہ الرحمہ)

یہ عجیب بات ہوگی کہ فقہ و فقاہت کا ذکر ہو اور حضرت صدر الافاضل علیہ الرحمہ کے قول کے مطابق "یہ اعلیحضرت کے احب الخلفاء ہیں" اور "اجڑو اجڑ دینا آپ سے سیکھتی ہے" اور حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کا تذکرہ نہ آئے۔

"ذبیحہ گاؤ" کے بارے میں آپکا فتویٰ بھی قابل ملاحظہ ہے۔ اس سے علم و حکمت کی نہ جانے کتنی شاہراہیں کھل جاتی ہیں۔

زراعت کے بہانے سے ہنود ہماری مذہبی رسم میں نہ صرف دست اندازی بلکہ اُس کا پورا انسداد چاہتے ہیں اور طرفہ یہ کہ اس پر مذہبی آزادی سے استفاد کرتے ہیں کیا مذہبی آزادی کے یہ معنی ہیں کہ ایک فریق کے خیالات کو کامیاب کرنے کیلئے دوسرے فریق کی دینی، مذہبی رسوم بند کر دی جائیں۔؟ ہندوستان میں روزانہ ہزاروں گائے ذبح ہوتی ہیں آجتک زراعت کو کونسا نقصان پہنچا جو آئندہ پہنچنے کی امید ـــــ قدرت کا قاعدہ ہے کہ جس چیز کی مانگ زیادہ ہوتی ہے اُسے زیادہ پیدا فرماتی ہے ـــــ گاؤ کشی بند ہونے سے زراعت کو تو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ سوا اسکے کہ کھیت میں پڑ کر تیار کھیت کو کھا جانیوالے اب دس ہیں تو جب سنو ہونگے

ہاں گوشت کو نقصان عظیم پہنچیگا۔ مسلمان اور عیسائی بلکہ ہنود کی بعض اقوام بھی طبعی طور پر غذائے گوشت کی عادی ہیں اسے بند کر کے صرف دال ساگ پر انھیں قانع کرنا ضرور انکی عافیت میں خلل انداز ہوگا ـــــ

اور ہرگز انکی صحت جسمانی ٹھیک نہیں رہ سکتی ۔ اور اسکے سوا حاجتوں کو سخت نقصان پہنچے گا .... علاوہ ازیں ہزاروں کام جن پر چمڑے کے کارخانوں کی بنا ہے اور لاکھوں روپے کی تجارت ہے اور ہزاروں آدمیوں کا رزق ۔ اور گورنمنٹ خزانے کیلئے لاکھوں کا محصول یہ سب امور یکسر بند ہو جائینگے اور ملک کی رفاہ و آسائش میں عام انقلاب واقع ہوگا جسکا ضرر نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام اقوام کو پہنچے گا ۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(رسائل رضویہ ص ۲۲۶)

حرفِ آخر

آج (جمعۃ المبارک ۱۹ رجب ۱۴۰۲ھ ۱۴ مئی ۱۹۸۲ء) کو جب میں اپنی اس کتاب "پاک و ہند کی چند اسلامی تحریکیں اور علمائے حق" کی آخری سطریں لکھ رہا ہوں ماضی کی بے شمار مقدس یادیں دل و دماغ کو منور کر رہی ہیں ۔

غالباً ۱۹۴۲ء کا کوئی مہینہ تھا جب ہم (میں اور میرے چچازاد بھائی مولانا مفتی غلام یسین صاحب حال مقیم کراچی) استاد العلماء حضرت شیخ الحدیث علامہ عبد المصطفیٰ صاحب الازہری مدظلہ العالی ابن صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کی زیر نگرانی دینی تعلیم حاصل کرنے کیلئے ، مبارکپور اعظم گڑھ کی عظیم درسگاہ "جامعہ اشرفیہ مصباح العلوم" میں داخل ہوئے اور ۱۹۴۶ء تک وہاں سلسلہ تعلیم جاری رہا ۔

اس وقت وہاں "جامعہ اشرفیہ" کے بانی حافظ الملت والدین حضرت مولانا حافظ عبد العزیز صاحب علیہ الرحمہ حضرت مولانا محدث اعظم پاکستان قبلہ سردار احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہم سبق اور صدر الشریعہ کے شاگرد شیخ الحدیث تھے ۔ اور حضرت علامہ عبد المصطفیٰ الازہری اور حضرت علامہ عبد المصطفیٰ صاحب اعظمی مدرس دوم تھے ۔

ان دنوں مبارکپور ہی میں حضرت علامہ ارشد القادری ، حضرت مولانا عبد المنان صاحب شیخ الحدیث ، قاری محمد یحییٰ صاحب اور دوسرے طلبا جو انکے ہم سبق تھے اور بعد میں تقریباً سبھی شیخ الحدیث ہوئے زیر تعلیم تھے

مبارکپور اعظم گڑھ کی یہ دینی درسگاہ اسوقت بھی ایک عظیم مثالی درسگاہ اور اپنوا اسکی

عظمت آسمانوں تک جا پہنچی ہے (الحمد للہ رب العلمین)

اس دارالعلوم کی عظمت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس نے بے شمار جید عالم اور اہل قلم پیدا کئے جنکا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انھیں دنوں حضور صدر الشریعت علیہ الرحمہ دارالعلوم میں دورۂ حدیث کے طلبار کا امتحان لینے تشریف لائے، دارالعلوم کی دوسری منزل پر بڑے ہال میں امتحان ہو رہا تھا۔ عصر کے وقت امتحان ختم ہوا نماز کیلئے باہر تشریف لائے تو کسی حدیث کی سند کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ آپ نے فرمایا عبد المصطفیٰ کہاں ہیں! انھیں بلاؤ متن و اسناد کے بارے میں اُن کا حافظہ عمدہ ہے!

اسی طرح جب ہم چھٹیوں میں گھر جاتے اور حضور صدر الشریعت موجود ہوتے تو ہم قدم بوسی حاصل کرنے میں دیر نہ کرتے۔ یہ انھیں کی دعاؤں کا اثر ہے کہ اللہ تو نے دینی بصیرت عطا فرمائی اور حق و باطل میں تمیز کرنے کا ملکہ بخشا۔

؎ سلامی جا بجا ارض و سما دیں
وخورشید پیشانی جھکا دیں
ترے خدام اے صدر الشریعت
جدھر جائیں فرشتے سر جھکا دیں

(علامہ شفیق جونپوری)

تشکر و امتنان کیلئے استاذی و استاذ العلمار حافظ الحدیث والسیر حضرت علامہ عبد المصطفیٰ صاحب الازہری زید مجدہ العالی ادام اللہ ظلہ شیخ الحدیث دارالعلوم امجدیہ کراچی کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ جنکی زیر نگرانی ہی سب کچھ حاصل ہوا اور ابتک اُن کی کرم نوازیاں جاری ہیں۔

اور اس کتاب کے مرتب کرنے میں آپ کی نہ صرف روحانی بلکہ مادی امداد بھی حاصل رہی۔ الحمد للہ رب العلمین علی منہ وکرمہ۔

قابل مطالعہ اور ایمان افروز کتابیں

نام کتاب

نور الایمان ۔ از مولانا عبدالحکیم فرنگی محلی
حیات النبی از علامہ سید احمد سعید شاہ صاحب کاظمی
میلاد النبی 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃
التبشیر مع التنویر 〃 〃 〃 〃 〃 〃
معراج النبی 〃 〃 〃 〃 〃 〃
کتاب التراویح 〃 〃 〃 〃 〃 〃
تسبیح الرحمن 〃 〃 〃 〃 〃 〃
الحق المبین 〃 〃 〃 〃 〃 〃
نفی النفل 〃 〃 〃 〃 〃 (زیر طبع)
تقریر منیر 〃 〃 〃 〃 〃 〃
الصوارم الہندیہ ۔ از مولانا حشمت علی خاں
محمد رسول اللہ قرآن میں ۔ از علامہ ارشد القادری
سوانح غریب نواز از ارشد القادری، مشتاق احمد نظامی
منکرین رسالت کے مختلف گروہ ۔ از علامہ ارشد القادری
امام نعت گویاں ۔ از جناب اختر الحامدی
انیس الارواح ۔ از خواجہ عثمان ہارونی
آئینہ حق ۔ از مولانا ابو النصر منظور احمد شاہ
فیوضات فریدی ۔ 〃 〃 〃 〃 〃
شہباز قدس ۔ 〃 〃 〃 〃 〃
قانون شریعت مکمل ۔ از مولانا شمس الدین رضوی (زیر طبع)
عقائد اہلسنت مولانا مشتاق احمد نظامی الٰہ آباد
الشاہ احمد رضا بریلوی
افضلیت صدیق اکبر ۔ از مفتی غلام سرور قادری
قہر خداوندی ۔ از مولانا حسن علی رضوی
برق آسمانی ۔ 〃 〃 〃 〃
طمانچہ از مولانا خلیل اشرف اعظمی
ہاتھی کے دانت 〃 〃 〃 〃
تحفۂ مومن (اردو) از جلال الدین سیوطی
اکابر دیوبند کا تکفیری افسانہ ۔ از حسن علی رضوی
الغراب الخبیث دیسی کوے کا حکم

نام کتاب

تفسیر نعیمی اول تا ہشتم فی جلد
مراۃ شرح مشکوۃ مکمل
گنبد خضرا اردو
خصائص کبریٰ اردو جلد اول
جواہر البحار اردو
جاء الحق کامل
تفسیر نور العرفان
مدارج النبوت اردو کامل
بارہ تقریریں
مواعظ رضویہ اول جلد
〃 دوم فی جلد
نورانی مواعظ اول
〃 دوم
〃 سوم
نورانی زیور
تذکرہ اکابر اہلسنت
تحفہ اثنا عشریہ اردو
ہمارا اسلام کامل
کلیات اعظم
فتاویٰ رضویہ اول تا پنجم
تحقیقی اور ادبی جائزہ
حدائق بخشش (اردو)
تاریخ الخلفاء اردو
شواہد النبوت اردو
تذکرۃ الاولیاء اردو
جذب القلوب
احکام شریعت
حدائق بخشش
ذکر جمیل
ذکر الحسین
شرح الصدور اردو
غوث الثقلین
غنیۃ الطالبین اردو
فتاویٰ افریقیہ
فتاویٰ مظہری
فتوح الغیب
مقیاس وہابیت
مقیاس النور

نام کتاب

مقیاس مناظرہ
رکن الدین کتاب الصلوۃ مجلد
خون کے آنسو
الاستمداد
تذکرہ مشائخ قادریہ
مکتوبات امام ربانی اردو کامل
حسام الحرمین
تبلیغی جماعت
زلزلہ
مشائخ چشت
کربلا کا مسافر
الخیرات الحسان مجلد
اوراق غم
بصیرت
تسکین الخواطر
الدولۃ المکیہ اردو
شمع شبستان رضا کامل
شرح قصیدہ بردہ شریف
شرح قصیدہ غوثیہ
کشف المحجوب اردو
کیمیائے سعادت 〃
کوثر الخیرات
رکن دین کتاب الحج
توضیح البیان
رسائل رضویہ اول
〃 دوم
مجموعہ رسائل کامل
ملفوظات اعلیٰحضرت کامل
سیرت رسول عربی
فیوض الرحمن ترجمہ تفسیر
روح البیان (اردو)
اول تا ہشتم
الدرر السنیہ اردو
الصواعق المحرقہ (عربی)
الشفاء قاضی عیاض (عربی)
تحفہ اثنا عشریہ فارسی
تفسیر ابن عباس عربی
سیر گلستان (ارشد القادری)

ملنے کا پتہ :- مکتبہ فریدیہ جناح روڈ ساہیوال